خطباتِ احمدیہ ــــ تحلیل و تجزیہ

ابوسفیان اصلاحی☆

Abstract:

"Sir Syed Ahmad Khan is one of the prominent Muslim personalities of subcontinents although controversially religiously in some matters, however his some achievements, politically as well as religiously are notable, Khutabaat-e-Ahmadia is one of them. Its subject matter is Seerah of the Holy Prophet Mohammad (ﷺ) Sir Syed wrote this book in respond of William Muir's Allegations on the Prophet and rejected all of the objections in the light of living evidences from Quran & Sunnah and logic also. The following detailed research article is an analytical study of Khutabbat - e - Ahmadia Raised in his book "Life of Mohammad."

سرسید کے تجدیدی کارناموں کی روشنی میں انھیں مجدد اور مفکّر کے القاب سے یاد کیا جائے تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔ بعض موضوعات ایسے ہیں جن میں سرسید کو تاسیسی درجہ حاصل ہے۔ اس کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے صرف اتنا اشارہ کرنا مناسب ہوگا کہ انھوں نے ہندوستانی مصنّفین اور اسلامی محققین سے متانت و معروضیت کا مطالبہ کیا، سیرت مقدسہ کے تعلّق سے مطالعۂ استشراق پر زور دیا اور تقابل ادیان میں خشتِ اول کا کردار ادا کیا نیز تفسیر قرآن کے لیے آسمانی صحیفوں سے استفادہ، اسرائیلیات سے عدم اعتناء اور ضعیف و موضوع روایات کو ناقابلِ اعتبار قرار دیا۔ سرسید نے ایک علمی انقلاب برپا کیا، تعقل پسندی پر اتنا زور دیا کہ کہیں کہیں جادۂ اعتدال سے ہٹ بھی گئے۔

سیرۃ النبی اور محبّت رسول ﷺ کے بارے میں سرسید کی پہلی تصنیفی دلیل ''جلاء القلوب بذکر المحبوب'' سے کیا۔ اس کتاب کی ترتیب کا مقصد یہ تھا کہ میلاد کے نام پر جو بہت سارے واقعات اور ضعیف روایات نقل کی جاتی جارہی ہیں یا محافل میلاد میں پڑھی جاتی رہی ہیں ان سے قطع نظر ایک صاف ستھری اور حقائق پر مبنی سیرت پاک پیش کی جائے۔ اس میلاد نامے میں سرسید نے بہت سی ایسی چیزیں نقل

☆ شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کی تھیں جن سے آگے چل کر سرسید کو خود بھی اتفاق نہ رہا۔ بہر کیف سرسید نے اسے ترتیب دے کر میلادناموں کی دنیا میں ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی۔(۱) اس کے علاوہ سرسید کے حب رسول کو ان کی مختلف تحریروں، تصانیف، تفسیر، تبیین الکلام اور مقالات میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مقالات سرسید میں ایسے بہت سے مقالات مل جائیں گے جن کی سیرت کے باب میں ایک مستند نمائندگی ہے۔(۲)

سیرت نگاری کے تعلّق سے سرسید کا سب سے بڑا، منفرد اور ممتاز کارنامہ ''خطبات احمدیہ'' ہے۔ یہ دراصل "Life of Mohammad" کا جواب ہے جسے ایک معروف انگریز، آگرہ اور اودھ کے لیفٹیننٹ گورنر سر ولیم میور (Sir William Muir) (۱۸۱۹ء۔۱۹۰۵ء) نے ترتیب دیا ہے جو ۱۸۶۵ء میں حکومت برطانیہ کے معتمد محکمہ خارجہ تھے اور ۱۸۶۸ء میں ہندوستان میں لیفٹیننٹ گورنر متعیّن کیے گئے۔ اپنی منصبی مصروفیات کے ساتھ ساتھ عربی، عبرانی اور فارسی زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ نیز تاریخ اسلام کا مطالعہ بھی کیا، انگریزی کے علاوہ بعض دیگر یوروپین زبانوں سے بھی واقف تھے۔ چھ سات کتب کے مصنّف ہیں وہ ایک باعمل عیسائی تھے۔(۳)

جہاں پادری سی.جی. پی فانڈر (۱۸۶۵ء۔۱۸۰۳ء) نے انہیں ایک تنقیدی سیرت پاک لکھنے کا مشورہ دیا۔(۴) لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تنقیدی اور تجزیاتی سیرت پاک کا ڈانڈا تخفیف و تنقیص سے مرتبط ہے۔ اس تنقیدی سیرت نگاری میں کچھ مقامات پر شعوری اور کچھ مقامات پر غیر شعوری طور پر غلطیاں کی گئی ہیں۔ ولیم میور اور بہت سے دیگر مستشرقین نے سرور کائنات ﷺ کی عظمت کو گھٹانے اور ہمہ گیریت کو سمیٹنے کی کوششیں کی ہیں مگر یہ سب رائیگاں گئیں اور دنیا کے سو بڑے لوگوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے مائیکل ہاٹ نے آپ کو سرفہرست رکھا۔ آج سے بہت پہلے قرآن کریم نے ''ورفعنالک ذکرک'' [اور ہم نے تیرا ذکر بلند کیا] کہہ کر یہ واضح کر دیا تھا کہ دنیا کے گوشے گوشے کو آپ کے ذکر، آپ کی ثناخوانی اور آپ کے اوصاف و امتیازات سے آباد کیا جائے گا، خود قرآن کریم نے آباد کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔ انہی تمام وجوہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے صراحت کر دی کہ:

''وإنک لعلی خلق عظیم'' (القلم: ۶۸/۴) (اور تو بے شک بڑے (عمدہ) اخلاق پر ہے۔)

اس کتاب کو دیکھنے اور اس کے مضامین کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد انھیں شدید دھچکا لگا اور ان کے ذہن میں ولیم میور کی صاف شفاف تصویر غبار آلود ہوگئی۔ کیوں کہ انھوں نے بہت سے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ دوسرے انھوں نے غیر مستند مآخذ پر انحصار کیا ہے اور تیسرے بہت سے ایسے واقعات نقل کیے جو تحقیقی اعتبار سے بہت لچر ہیں، اس طرح کی بے احتیاطیاں مسلم علماء اور مستشرقین دونوں کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ سرسید رقم طراز ہیں:

''آنحضرت کی زندگی کے حالات جن کو مسلمان سیر اور انگریز لائف کہتے ہیں۔ صرف دین دار مسلمان عالموں ہی نے نہیں لکھے بلکہ غیر مذہب کے علماء اور مؤرخین نے بھی

بہت کچھ لکھا ہے مگر نہایت افسوس ہے کہ وہ دونوں افراط وتفریط میں پڑ گئے۔ پہلوں کی آنکھوں میں تو کمال روشنی کے سبب چکا چوند آ گئی اور پچھلوں کی آنکھیں بجلی کی چمک سے بند ہو گئیں۔ پہلے تو شراب محبّت کی سرشاری میں بات سے بھٹک گئے اور پچھلے اس راستہ کی ناواقفیت سے منزل تک نہ پہنچے۔ پہلے تو یہ بھولے کہ وہ کس کا بیان کرتے ہیں اور پچھلوں نے اسی کو نہ جانا کس کا وہ ذکر کرتے ہیں۔"(۵)

آنحضورﷺ سے سرسید کی دینی، ذہنی، اور فکری وابستگی تھی، اور یہ حب رسالت صرف عقیدت پر مبنی نہیں بلکہ متدل سوچ پر منحصر تھی۔اسی لیے انھیں ولیم میور کی تبشیریت اور غیر علمی انداز پر رونا آیا اور یہ طے کیا کہ ولیم میور کی استشراقی عیاریوں کا دلائل کی روشنی میں جواب دیا جائے۔ چنانچہ جواب دینے کے لیے اس کا فارسی میں ترجمہ کروایا۔(۶) اور ۱۸۶۹ء میں انگلستان کا سفر کیا اور اپنے سوا سال کے قیام میں برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری سے خاصا استفادہ کیا۔ کیوں کہ بہت سے ایسے مصادر اور مراجع تھے جو ہندوستان میں دستیاب نہیں تھے۔مولانا الطاف حسین حالی ماخذ کے باب میں یوں لکھتے ہیں:

"انھوں نے انڈیا آفس کے کتب خانہ سے کتابیں بہم پہنچائیں۔ برٹش میوزیم کی لائبریری سے بہت سی اطلاعات حاصل کیں، سیر کی عربی کتابیں جو مصر و فرانس اور جرمنی میں چھپی تھیں وہاں سے منگوائیں اور چند لیٹن اور انگریزی کی پرانی کتابیں جو نایاب تھیں بہت گراں قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں اور شب و روز کی لگاتار محنت سے بارہ ایسے خطبے یا مضمون لکھ کر ایک لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے اور لندن ہی میں "خطبات احمدیہ" کے نام سے اس کو چھاپ کر مشتہر کیا۔"(۷)

سرسید نے پہلے اس کا جواب اردو میں تحریر کیا۔اس کے بعد اسے انگریزی میں منتقل کروایا۔ لیکن اردو ایڈیشن انگریزی ایڈیشن کے سترہ سال بعد ۱۸۸۷ء میں منظر عام پر آیا۔ یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ انگلستان کا سفر، وہاں کا قیام، ماخذ کے تراجم اور خطبات احمدیہ کی تسوید اور اس کے انگریزی ورژن کی طباعت ایسے مسائل تھے جو سرسید کے لیے انتہائی پریشان کن تھے کیوں کہ وہ معاشی بدحالیوں کا شکار تھے۔سرسید کے نہایت عزیز دوست نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں رقم طراز ہیں:

"جب سید احمد خاں لندن جانے کو تھے تو مالی مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادے کو پورا نہ کر سکتا مگر انھوں نے اپنا نہایت قیمتی کتب خانہ فروخت کر ڈالا۔اپنے گھر اور کوٹھی کو رہن رکھ دیا اور لندن کے سفر کی تیاری کی۔"(۸)

جب اس سے بھی ان کا مقصد پورا نہ ہوتا ہوا دکھائی دیا تھا تو دوستوں سے قرض لیا تاکہ اس کی طباعت میں کسی طرح کی تاخیر نہ ہو۔اپنے اسی تکمیل عشق رسول کے لیے سود پر بھی قرض لینا گوارا کیا۔اسی سلسلے میں اپنے دوست محسن الملک کو تحریر کیا:

"چاہے میں محتاج، فقیر، بھیک مانگنے کے قابل ہو جاؤں، مگر کتاب ضرور چھپواؤں گا۔

تا کہ جب قیامت کے دن میرا نام پکارا جائے تو خدا فرمائے کہ سید احمد کو بلاؤ جو اپنے نانا کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا۔"(۹)

ایک خط میں یہ بھی تحریر کیا کہ: "اگر میری یہ کتاب تیار ہوگئی تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر سمجھوں گا۔ خدا قبول کرے۔"

مآخذ کے تعلّق سے سرسید کا ایک خط اور نقل کیا جا رہا ہے جس میں سرسید کی ان اندرونی کیفیت کو بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ انھیں اس کتاب کے آنے سے کسی قدر دلی رنج ہے۔

"ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے، ولیم صاحب نے جو کتاب آنحضرت کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی نا انصافیاں اور تعصّبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا اور مصمّم ارادہ کیا کہ آنحضرتﷺ کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا۔ کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاوے گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمدﷺ کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا حاضر کرو، مارا نغمہ شاہنشاہی بس است۔ میں نے فرانس اور جرمن سے اور مصر سے کتب سیر منگانی شروع کر دی ہیں۔ چٹھیات روانہ ہوگئیں۔ سیرت ہشامی مطبوعہ اور چند کتابیں لیٹن کی خرید لیں۔ ایک آدمی مقرر کر لیا جو لیٹن کا ترجمہ کر کے مضمون بتلا سکے۔"(۱۰)

ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے سرسید جنونی ہو گئے تھے۔ اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار تھے پر انھیں کسی طرح گوارا نہ تھا کہ سرورِ کونینﷺ پر بے بنیاد الزامات لگائے جائیں۔ انھوں نے مولوی سید مہدی علی خاں کو خط لکھتے ہوئے اپنے جذبات کو ان لفظوں میں قلم بند کیا:

"آپ اس خط کے پہنچنے پر میر ظہور حسین کے پاس جائیے اور میری یہ درخواست ہے دونوں صاحب مل کر کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپے قرض لیجیے، سود اور روپیہ میں ادا کروں گا، ہزار روپیہ بھیجنے کے لیے دلی لکھا ہے اور میں نے لکھا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ ظروف مسی تک فروخت کر کر ہزار روپیہ بھیج دو۔۔۔ کیا کہیے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے۔ خدا مدد کرے۔"(۱۱)

ایک دوسرے خط میں مزید لکھتے ہیں:

"میں روز و شب تحریر کتاب سیر مصطفویﷺ (یعنی خطباتِ احمدیہ) میں مصروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے، لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے۔"(۱۲)

ولیم میور کی گستاخیوں سے سرسید ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے، وہ یہاں تک لکھ گئے کہ "آئندہ ڈاک میں فہرست لاگت کتاب بھیجوں گا جس سے معلوم ہوگا کہ کس قدر خرچ ہوا۔ آپ نے اور تمام دوستوں نے جس قدر مدد کی وہ نہایت ہی عمدہ اور بہت ہی غنیمت تھی ورنہ زہر کھا کر مر جانے کے سوا اور کچھ چارہ نہ تھا۔"(۱۳)

سرسید کی اس عظیم دینی اور علمی خدمات کا اعتراف شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے بڑے بھلے انداز میں اس طرح کیا ہے:

''اس وقت مسلمانوں میں آج کل جیسا قحط الرجال نہ تھا بلکہ بڑے بڑے فاضل اور جید علماء موجود تھے جن کی ساری عمر قال اللہ اور قال الرسول میں گزری تھی۔ جنھوں نے مختلف فیہ مسائل پر سینکڑوں کتابیں لکھی تھیں اور لکھ رہے تھے مگر پورے ملک میں ایک عالم کے بھی کان پر جوں نہ رینگی اور کسی کو بھی احساس نہ ہوا کہ یہ اسلام اور بانی اسلام علیہ الصّلوٰۃ والسّلام پر کتنا بڑا اہم بم پھینکا گیا ہے اور اسے پڑھ کر کتنا سادہ لوح اور ناواقف انگریزی خواں مسلم نوجوان ذات نبوی سے بدظن ہو کر عیسائیت کی آغوش میں چلے جائیں گے اس ملک کے مسلمانوں میں سے، بلکہ صحیح طور پر یوں کہیے کہ ایرانی و ترکستانی، عرب و عراق، شام و مصر، تونس و طرابلس، الجیریا و مراکش غرض تمام دنیائے اسلام میں سے صرف سرسید ایسا پیدا ہوا جو اگرچہ انگریزی نہیں جانتا مگر اس نے اس کتاب کو منگوایا اور اس کا ترجمہ کروا کے اس کے مضامین کو پڑھا اس کا دل جل کر کوئلہ ہو گیا۔''(۱۴)

مذکورہ سطور سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ولیم میور کی علمی بددیانتیوں سے سرسید کو کس درجہ قلق اور صدمہ تھا وہ اس کی تردید کے لیے بہر حال تیار تھے۔ جب مختلف موانع و مشکلات سے گزرتے ہوئے یہ کتاب طباعت کے مرحلے سے گزر گئی تو اس پر آپ نے اپنی انتہائی خوشی کا اظہار مندرجہ الفاظ میں کیا:

''میری کتاب خطباتِ احمدیہ ایک مسلمان متبحر نے پڑھی جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے جو الفاظ کہ اس نے کہے اور مجھے لکھے اور جس طرح میرے ہاتھ چومے اس کی لذت میں جانتا ہوں، کتاب جلد بندی سے تیار ہو گئی۔ اور کتب فروش کی دکان میں فروخت کو رکھی گئی۔''(۱۵)

خطبات احمدیہ کے انگریزی ترجمہ پر سرسید کو شرح صدر حاصل تھا۔ آپ کی خواہش تھی کہ زبان و بیان کے اعتبار سے یہ کتاب اعلیٰ مرتبت پر فائز ہو، کیوں کہ یہ انگریزوں کے لیے لکھی گئی تھی۔ انہیں کے سامنے حقائق کو پیش کرنا تھا۔ سیرت مطہّرہ کے تعلّق سے ان کے علماء کرام نے جو بدگمانیاں پیدا کر ڈالی تھیں ان کا تسلّی بخش اور مدلل جواب دینا، اگر زبان میں سقم ہوا اور انداز غیر موثر رہا تو اپنی تمام تر معنوی صلابت کے باوجود انھیں متاثر نہ کر سکے گی۔ اسی لیے سرسید شستہ اور شگفتہ علمی زبان میں اسے پیش کرنے کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ اللہ نے ان کی اس خواہش کو پار لگایا۔ محسن الملک کو لکھتے ہیں:

''میری دانست میں نہایت خیر خواہی اسلام کی اور سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ کتاب انگریزی زبان میں چھاپی جاوے۔ اس لیے انگریزی چھاپنا شروع کر دیا اور اردو ابھی ملتوی ہے۔ علاوہ ازیں اس کے انگریزی عبارت لکھنے والے عمدہ اور کم قیمت پر یعنی بہ نسبت ہندوستان یہاں ملے ہیں ہندوستان میں ممکن نہ تھا جو شخص کی میری کتاب انگریزی میں لکھتا ہے اس کی لیاقت کا کوئی انگریز ہندوستان میں نہیں ہے

پس ایسا شخص ہندوستان میں کہاں ملتا۔ اگر میری یہ کتاب طیار ہوگئی جس میں دس باب ہیں تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر اور باعث اپنی نجات کا سمجھوں گا خدا قبول کرے۔ آمین۔''(۱۶)

ولیم میور کی کتاب سرسید پر کوہ الم بن کر ٹوٹی۔ یہی وجہ ہے کہ اس رنج والم سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور سچے محبّ رسول کی یہی شناخت ہے۔ ایک طرف مالی دشواریاں اگر زنجیر پا بنی ہوئی تھیں تو دوسری طرف حکومتِ برطانیہ کی عداوت مول لینی بھی ان کے لیے آسان نہ تھی۔ کیوں کہ ان کے ذہن میں بہت سے ملی مسائل اٹھ رہے تھے۔ مدرسۃ العلوم کی تاسیس ان کے دماغ میں پرورش پا رہی تھی۔ بنفس نفیس حکومتِ برطانیہ کے ملازم تھے اور انہی ایام میں بیٹے سید محمود کو حکومتِ برطانیہ کی جانب سے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان جانے کے لیے ایک وظیفہ بھی ملا تھا۔ اب ایسے میں ایک موثر لیفٹیننٹ گورنر ولیم میور کے لیے تیغ بے نیام ہونا آسان نہ تھا۔ لیکن ان تمام تحفّظات اور نزاکتوں کو بالائے طاقت رکھتے ہوئے دریائے آگ میں کود پڑے جوان کے لیے بردوسلام بن گئی۔ شیخ اسماعیل پانی پتی نے سرسید کے آہنی عزم اور حب رسول کا تجزیہ یوں کیا ہے:

''دنیا میں ڈرپوک، بزدل اور خوشامد پسند لوگ بھی بکثرت ہوتے ہیں اور ہر زمانہ میں ہوتے ہیں، چنانچہ جب اس بات کی عام شہرت ہوئی کہ سید احمد خاں ولایت جا کر سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنا چاہتے ہیں تو سرسید کے بعض ملنے والوں نے ان کو اس ارادے سے بہت سختی کے ساتھ روکنا چاہا اور طرح طرح سے فضاء کی غیر موزونیت کو سمجھانا چاہا کہ موقع، وقت اور مصلحت ہرگز ایسی نہیں کہ ایسا اقدام کیا جائے۔ خواہ مخواہ اپنی جان کو مصیبت میں کیوں ڈالتے ہو، نوکری سے بھی جاؤ گے اور آزادی سے بھی۔ نہ صرف تمہیں قید ہوگی بلکہ بہت ممکن ہے کہ پھانسی کا بھی حکم ہوجائے۔ غدر ابھی ہو چکا ہے اور انگریز کا غصہ ابھی کم نہیں ہوا۔ اس غصہ کی آگ میں تم بھسم ہوکر رہ جاؤ گے، پہلے ہی مرتے مرتے بچے ہو۔ جب تم نے ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالا تھا، ویسی ہی بیوقوفی پھر کرنے لگے ہو۔ اور نئی کتاب لکھ کر اپنے سر پر نئی مصیبت لانا چاہتے ہو۔''(۱۷)

خطبات احمدیہ سرسید کا ایسا کارنامہ ہے جس نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ سرسید کے نزدیک مستشرقین یا معاندین کی تحریروں پر واویلا مچانا، چیخ وپکار کرنا اور تحریروں میں لعن طعن کرنا غیر سنجیدہ عمل ہے۔ نکتہ سنجی اور بصیرت کا تقاضا ہے کہ ان تحریروں کا علمی وتحقیقی جواب دیا جائے۔ خطبات احمدیہ اس طرح کا ایک مدلل ومبرہن جواب ہے۔ اس جواب کے آنے سے عیسائیت میں ایک کھلبلی مچی۔ جس کا ذکر سرسید نے یوں کیا ہے:

''۱۸۷۰ء میں جبکہ خطبات احمدیہ چھپ کر شائع ہوئی تو اس پر لندن کے ایک اخبار میں انگریز نے لکھا تھا کہ عیسائیوں کو ہوشیار ہونا چاہیے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے

انھیں کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے جو عیسائی اس کے خوشنما چہرے پر لگاتے ہیں۔''(۱۸)

عیسائیوں کے ایک طبقہ کی یہ ایک غیر دانش مندانہ وغیر منصفانہ سوچ تھی لیکن ایسا بھی نہیں کہ تمام تر عیسائیت اس تعصب اور غیر عادلانہ نہج کی شکار ہے۔ چنانچہ ایک معروف عیسائی محقق، عالم اور آثار الصنادید کا مترجم گارسی دتاساں کا خیال ہے کہ سرسید نے جس طرح توریت، زبور اور انجیل کی تفسیر وتشریح کی ہے وہ انداز ہمارے عیسائی محققین کے یہاں نہیں ملتا۔ اس نے بڑے کھلے دل سے یہ اعتراف کیا ہے کہ توریت اور زبور کی آیات کریمہ پر سرسید کی گہری نظر ہے۔(۱۹) اسی طرح خطبات احمدیہ اور تبیین الکلام میں بے شمار عبرانی مفردات پر تجزیاتی تبصرہ موجود ہے اس کا بھی ان کے یہاں فقدان ہے۔ اسی طرح بہت سے علم دوست اور انصاف پسند عیسائی علماء نے بھی سرسید کی علمی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ سرسید کے سیرت نگار کرنل گریہم (Colonel G.F.I. Graham) خطباتِ احمدیہ کے متعلق رقم طراز ہیں:

''ان خطبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنّف کا غیر معمولی تعمق نظر، دیگر مذاہب کے ساتھ حد درجہ رواداری اور اصلی عیسائیت کے سچے اصول کا حد درجہ احترام کرتے۔''(۲۰)

سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے مطالعۂ استشراق میں تفکّر وتدبر پر زور دیا اور اس تناظر میں جذباتیت اور سب وشتم کو ناپسند کیا۔ وہ کتاب کا جواب کتاب سے دینے کے متمنّی تھے۔ ولیم میور نے سیرت کے تعلّق سے بہت سے مسائل اٹھائے ہیں اور ان مسائل کی روشنی میں آنحضورﷺ کی شخصیت اور اسلام کی حقانیت کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ولیم میور کی ان بے بنیاد نکات کا خطباتِ احمدیہ میں دانشورانہ جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ سرسید نے اپنی تفسیر، مقالات اور تصانیف میں جابجا حدیث کی صحت وسقم پر اظہار خیال کیا ہے۔ اگر ان بکھرے ہوئے مباحث کو یکجا کیا جائے۔ تو حدیث لٹریچر میں کارآمد اضافہ ہوسکتا ہے۔ نیز سرسید نے اپنے نظریۂ قانونِ فطرت کے پیش نظر جہاں حدیث کے تئیں غیر ذمہ دارانہ موقف اختیار کیا ہے اس پر تنقید بھی کی جاسکتی ہے۔ تہذیب الاخلاق میں سرسید نے حدیث کی صحت وسقم پر مضامین تحریر کیے ہیں، جن سے محدثین کی غیر ذمہ داریوں کو سمجھا جاسکتا ہے۔(۲۱) اسی ضمن میں سرسید نے واقدی کی بے احتیاطیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کی انہی کوتاہیوں سے مستشرقین نے فائدہ اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر (Springer) اور ولیم میور دونوں نے واقدی سے استفادہ کیا۔ سرسید نے ''مواہب لدنیہ'' کی شرح کی روشنی میں بتایا کہ واقدی ایک غیر معتبر شخص ہے۔(۲۲) جیسا کہ شرح میں ''میزان'' کے حوالے سے کہا گیا:

''**الواقدی محمد بن عمر بن الواقدی الاسلمی المدنی الذی استقراء الاجماع علی وهنه**''(۲۳)

(واقدی محمد بن عمر واقدی، اسلمی، مدنی کے ضعف پر اجماع کلی ہے۔)

سرسید نے اپنی کتاب میں بہت سے مستشرقین کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ منجملہ کو

ہدف تنقید بنایا ہو، انصاف پسند مستشرقین کی مدح سرائی بھی ہے۔ ان کے یہاں تسوید و تحقیق کبھی بھی عدل وانصاف سے علاحدہ ہوکر نہیں چل سکتی۔ ایک طرف متعصّب مستشرقین کا خطبات احمدیہ میں ذکر کیا گیا تو دوسری طرف انصاف پسند مستشرقین کی بھی توصیف کی گئی مثلاً گرتھہ، اماری، تالدائک اور دواری کی تصانیف سے سیرت طیبہ کی حقیقی تصویر ابھرتی ہے۔ کواٹر لی ریویو کے ایک مقالہ کا ذکر کرتے ہوئے سرسید نے بتایا کہ:

> ''ان مؤرخوں نے بہت سی دنیا کو یہ بات سکھلا دی کہ مذہب اسلام ایک شگفتہ اور تروتازہ چیز ہے اور ہزاروں ثمر ور جوہروں سے بھر پور ہے اور محمد (ﷺ) کی خصلت کو کیسا ہی سمجھا جاوے، انسانیت کی سنہری کتاب میں اپنے لیے جگہ حاصل کی ہے۔''(۲۴)

اسلام اور اللہ کے رسول ﷺ کے تئیں جن متعصّبین نے طعنہ وتشنیع کا بیڑا اٹھا رکھا ہے اس میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر اسپرنگر کا ہے جس کی انگریزی کتاب ۱۸۵۱ء میں الہ آباد سے چھپی۔ یہ کتاب بھی بغض وعناد کا پلندہ ہے۔ اس کی اصلیت اور مصنّف کی دریدہ دہنی کا ذکر سرسید نے مندرجہ ذیل لفظوں میں کیا ہے:

> ''مگر وہ کتاب بسبب غلطیوں کے جو اس کے مضمون کی صحت میں ہیں کچھ اعتبار کے لائق نہیں ہے، علاوہ اس کے ایک اور خرابی انھوں نے اس کتاب میں یہ کی ہے کہ اس کا طرزِ بیان نہایت مبالغہ آمیز اختیار کیا ہے۔ ان کی طبیعت پہلے ہی سے ایسے تعصّبات اور یک طرفہ رائے سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے جو کسی قسم کے مصنّف کو اور بالتخصیص ایک مؤرخ کو کسی طرح زیبا نہیں ہے۔''(۲۵)

سرسیّد اپنی کتاب میں مذکورہ مستشرق کی اسلام دشمنی اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف ہرزہ سرائی کی مثال نقل کرتے ہیں جس سے مستشرقین کے متعصّب طبقے کے خبثِ باطن کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> ''اسلام محمد ﷺ'' کا ایجاد نہیں ہے، وہ ایسے مکار کا نکالا ہوا مذہب نہیں ہوسکتا، مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اس مکار نے اپنی بداخلاقی اور طبیعت کی برائی سے اس کو بگاڑا اور جو بہت سے مسائل اس میں قابل اعتراض ہیں وہ اسی کی ایجاد ہیں' نعوذ باللہ من هذه الاقاويل. كبرت كلمة تخرج من افواههم ان يقولون الا كذبا. (۲۶)

ڈاکٹر اسپرنگر کی ایک کتاب چھ جلدوں میں بزبان جرمن ہے۔ سرسید نے فرمایا کہ جرمن زبان سے ناواقفیت کی بناء پر میں استفادہ کرنے سے قاصر ہوں لیکن میرے ایک جرمن دوست نے بتایا کہ یہ کتاب ابن اسحٰق اور واقدی پر مبنی ہے اس لیے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کس نوعیت کی کتاب ہے۔ یقیناً دیگر کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی تعصّبات کا مجموعہ ہے۔ اس کا تحقیق وتجزیہ سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ یہ صحیح، غلط، مشتبہ اور لغو روایات کا ذخیرہ ہے۔ (۲۷)

مستشرقین کا اختصار سے جائزہ لیتے ہوئے سرسید نے بتایا کہ ولیم میور کی کتاب کی اصل بنیاد واقدی پر ہے جس کا مسلمانوں کے یہاں کوئی اعتبار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضور ﷺ کی صاف

وشفاف تصویر کو بگاڑنے کی کوشش کی گئی ہے اور اسلام کی حقانیت کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ پی فندر نے ولیم میور کو مستند مآخذ کی روشنی میں سیرت طیبہ کو ترتیب دینے کے لیے کہا تھا لیکن اس کے برعکس تعصّب کو بنیاد بنایا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پی فندر اور ولیم میور دونوں اسلام دشمنی کا شکار تھے۔ سرسید نے اس دشمنی کا ذکر یوں کیا ہے:

> ''لیکن میں نہایت افسوس سے یہ بات کہتا ہوں کہ باوجود یکہ سر ولیم میور صاحب نہایت نیک طبیعت ہیں اور بڑی قابل توصیف لیاقتیں رکھتے ہیں۔ اس پر ان کی طبیعت پر اس غرض اور منشاء کا جس سے وہ کتاب لکھنی شروع کی ایسا اثر پیدا ہوا جیسا کہ ایسی حالت میں اوروں کی طبیعت پر پیدا ہونا قیاس کا مقتضا ہے اور اس سبب سے اسلام کی دلچسپ اور سیدھی سادی عمدہ باتیں بھی ان کو بری اور بھونڈی اور نفرت انگیز معلوم ہوئیں اور یہ اثر ان کی طبیعت کا ایسا تھا کہ اس کے سبب سے ان کی کتاب پڑھنے والے اپنے ذہن میں ان کی تحریر کو ایک زیادتی سمجھتے تھے۔ لیکن جیسا اکثر ہوتا ہے۔ ویسا ہی اس میں بھی ہوا کہ اس حد اعتدال سے متجاوز تحریر نے سر ولیم میور صاحب سے اس کتاب کے لکھنے کی خواہش کی تھی بلکہ برعکس اس کے یہ نتیجہ ہوا کہ جس شخص کو پی فندر نے تاریکی کا فرشتہ بنانا چاہا تھا وہ روشنی کا فرشتہ نکل آیا۔''(۲۸)

خطباتِ احمدیہ کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ عربوں کے حسب ونسب اور ان کے عادات و اطوار کا نہایت مستند خاکہ پیش کیا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ عربوں کی رسومات کا جائزہ لینے کے لیے کلام عرب کو بنیاد بنایا گیا، کیوں کہ یہ سبھی کو معلوم ہے کہ ''الشعر دیوان العرب''یعنی عربوں کی وضع قطع کی سچی تصویر ان کے اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اسی لیے سرسید نے مختلف اشعار نقل کرتے ہوئے ان کی حرکات وسکنات کو پیش کیا ہے۔ جس کا اردو سیرت نگاروں کے یہاں فقدان ہے۔ عرب کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے محقق کا کردار ادا کیا ہے۔ سرسید اسلامیات کے بنیادی مآخذ سے واقف تھے۔ چنانچہ اس موضوع پر لکھتے ہوئے عبرانی مآخذ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ احقر کا خیال ہے کہ اردو سیرت نگاروں میں ایک بھی ایسا سیرت نگار نہیں ہے جو عبرانی زبان سے واقف ہو۔ چنانچہ جزیرۃ العرب کے متعلّق سرسید نے تحریر کیا'کتاب توریہ ثنی باب (۱)، ورس (۷)، اور باب (۲) ورس (۸) میں لفظ عربہ پایا جاتا ہے۔ وجہ تسمیہ کے موضوع پر طویل گفتگو کی گئی ہے۔ لفظ عربہ کے معنی وادی اور بیابان کے ہیں۔ چوں کہ عرب کا ایک بڑا حصہ وادیوں اور بیابان پر مشتمل ہے اس لیے اسے عرب کہا جاتا ہے۔ ہر قصبہ کے نام کے پہلے ''عربہ'' لگایا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جزیرے کے ایک حصہ کو''عربات'' کہا جاتا ہے۔ سرسید نے اپنی یہ توجیہہ''کتاب توریہ'' کے حوالے سے پیش کی ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ تہامہ کے پاس ایک گاؤں کا نام''عربہ'' تھا۔ اسی کی وجہ سے پورے جزیرے کو جزیرۃ العرب سے موسوم کیا گیا۔ جس سے سرسید کو اتفاق نہیں ہے۔ چوں کہ سرسید عبرانی اور عربی سے بخوبی واقف تھے اس لیے انہیں قیاس آرائیوں

پر یقین نہیں آتا تھا۔ خطبات احمدیہ میں اس تعلّق سے مزید مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ لیکن خوف طوالت سے اسے یہاں قلم انداز کیا جارہا ہے۔[۲۹]

سرسید نے عربوں پر بحث کرتے ہوئے قوم عاد کا ذکر کیا ہے اس کے متعلق بہت سی روایات ایسی ہیں جنہیں میزان عقل وفہم میں نہیں رکھا جاسکتا، مثلاً بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ قوم عاد کے ہر شخص کا قد بارہ ارش لمبا تھا یعنی اس زمانہ کے جولوگ ہیں اگر اپنے دونوں ہاتھوں کو سیدھا پھیلا دیں تو ان کی لمبائی سے بارہ گنا زیادہ لمبا قد قوم عاد کا تھا۔ بعض کتابوں میں ان کے قد کا لمبان کا اس سے بھی زیادہ مبالغہ کیا گیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی قوت کا یہ حال تھا کہ چلنے میں ان کے پاؤں زانوں تک زمین میں دھنس جاتے تھے۔[۳۰]

قوم عاد کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے مؤرخین نے ''باغ ارم'' کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کی تصویر کشی میں انتہائی مبالغہ آرائی کی گئی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کی سرزمین پر لعل اور یاقوت بچھے ہوئے تھے اور اس کی دیواریں سونے اور چاندی کی تھیں۔ درخت زمرد، یاقوت، نیلم اور قسم قسم کے جواہرات سے بنائے گئے تھے اور زعفران بجائے گھاس اور عنبر بجائے مٹی کے تھا۔ تاریخ میں یہ بھی پایا جاتا ہے کہ معاویہ ابن ابی سفیان کے زمانہ خلافت میں ایک آدمی وہاں جا کر بے شمار جواہرات سے اپنی جھولی بھر لایا جب خلیفہ نے وہاں جانے کا قصد کیا تو ہزاروں جتن کے باوجود بھی وہاں تک رسائی نہ ہوسکی۔ حضرت علی کے حوالے سے یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ یہ باغ ارم آسمان پر اٹھالیا گیا اور قیامت کے دن دیگر بہشتوں کے ساتھ یہ باغ ارم بھی ایک بہشت کی حیثیت سے نمودار ہوگا۔ سرسید نے مذکورہ تمام خیالات کو بے بنیاد قرار دیا ہے۔[۳۱] سرسید نے لفظ ''ارم'' پر بھی روشنی ڈالی ہے اور بتایا کہ قوم عاد کے اجداد میں کسی کا نام ''ارم'' تھا۔ جس کی طرف قوم عاد کا انتساب تھا۔ اسی کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح کیا گیا ہے:

''أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ. إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ. الَّتِیْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِیْ الْبِلَادِ'' (الفجر: ۸۹/ ۶۔۸)

(کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے عادیوں کے ساتھ کیا کیا، ستونوں والوں ارم کے ساتھ، جس کے مانند (کوئی قوم) ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی۔)

اس آیت کریمہ میں ذات العماد سے قوم عاد کا قد آور اور قوی ہونا مراد ہے جس کا ذکر دوسری آیت کریمہ میں اس طرح کیا گیا ہے:

''وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمَانِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْماً فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرعىٰ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٌ'' (الحاقہ: ۶۹/ ۷)

اور عاد بے حد تیز وتند ہوا سے غارت کردیئے گئے جسے ان پر لگاتار سات رات آٹھ دن تک (اللہ نے) مسلّط رکھا پس تم دیکھتے ہو کہ یہ لوگ زمین پر اس طرح گر گئے جیسے کہ

کھجور کے کھوکھلے تنے ہوں۔)

اس آیت کریمہ میں انھیں ''كأنه أعجاز نخل خاويه'' سے تشبیہ دینا بھی علامت ہے کہ قد کے اعتبار سے قوم عاد ایک عدیم النظیر قوم تھی۔ ان کے قد کی مثال دیگر اقوام میں نہیں ملتی ہے۔ سرسید نے مزید فرمایا کہ ارم سے مراد بنی ارم ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے بنی ہاشم اپنے دادا ہاشم سے منسوب کیے جاتے تھے اب اگر کوئی انہیں عجب الخلقت قرار دے یا انسانوں سے علاحدہ کر کے انھیں نئے نئے امتیازات سے جوڑنا شروع کر دے تو مناسب نہیں۔ (۳۲)

سرسید نے عربوں کے حسب ونسب اور تاریخی سلاسل کو موضوع بحث بناتے ہوئے بہت سے قیمتی مباحث پر بھی اظہار خیال کیا۔ مثلاً قوم ثمود، عرب العاربہ اور عرب المستعمرۃ پر لکھتے ہوئے اہم نکات اٹھائے ہیں۔ ان نکات کی تلاش میں صحف آسمانی، قرآن کریم، روایات اور مستشرقین کے خیالات سے معاونت حاصل کی ہے۔ اسی طرح اس میں حضرت ابراہیم علیہم السّلام کے بیٹے کی قربانی کا مسئلہ بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے اور اس اختلاف کی طرف اشارہ کیا گیا کہ یہ اشارہ حضرت اسماعیل علیہ السّلام کی طرف ہے یا حضرت اسحٰق علیہ السّلام کی طرف؟ سرسید نے توریت مقدس، قرآن کریم اور حدیث کا ذکر کرنے کے بعد بتایا کہ ان کی کوئی ایسی صراحت نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ ذبیح اللّٰہ کون ہے؟ سرسید کا یہ نقطہ نظر بے بنیاد ہے۔ (۳۳) اس مسئلے کو مولانا فراہی نے اپنی کتاب ''الرای الصحیح فیمن هو الذبیح'' میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ صحف آسمانی، قرآن کریم اور احادیث سے دلائل دیتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السّلام ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی زبان میں اب تک ایسی مدلل کتاب نہیں لکھی گئی۔ (۳۴) یہی بازگشت علامہ شبلی کی سیرۃ النبی میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ (۳۵) اپنے اس نقطہ نظر کو مدلل بنانے کے لیے علامہ نے اپنے شاگرد مولانا حمید الدین فراہی سے استفسار کیا، جس کی شہادت مکاتیبِ شبلی میں بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ (۳۶)

اس کتاب میں سرسید نے عربوں کے مراسم اور عادات پر بھی روشنی ڈالی ہے عربوں کے عادات واطوار کی واضح تصویر دو چیزوں کلام عرب اور قرآن کریم میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہی دونوں حقیقی مصادر ومراجع ہیں۔ عربوں کے مراسم کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تجارت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے دور دراز کے اسفار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ عربوں کے یہاں کفایت شعاری ایک مستحسن عمل تھی جس کا ذکر باہلی نے اپنے بھائی کے مرثیہ میں اس طرح کیا ہے:

تكفيه فلذة لحم إن الم بها

من الشواء ويكفى شر به الغمر (۳۷)

معتدل نیند بھی ان کے یہاں ایک نعمت سے کم نہ تھی۔ ہذلی نے اس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے:

قليل غرار النوم اكبر همه

دم الثار أویلقی کمیا مسفعا(۳۸)

علی الصباح اٹھنا بھی عربوں کے یہاں اچھی عادت میں شمار تھا جیسا کہ امرالقیس اسے ایک قابل ذکر چیز سمجھ کر یوں اظہار کرتا ہے:

وقد اغتدی والطیر فی وکناتھا(۳۹)

عربوں کے یہاں مہمان نوازی، سخاوت اور ایثار کا ذکر خاصہ ملتا ہے۔ مہمان نوازی ان کی خصوصیات کا جزءلاینفک تھی۔ ضیافت میں وہ کیا کیا کر بیٹھیں اور اپنے کتنے جانوروں کو ذبح کر دیں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ اس طرح کی داستانوں سے ان کی تاریخ مملو ہے۔ سفراء کی تکریم کو اپنا فریضہ تصور کرتے۔ اس اکرام واعزاز سے کسی کے یہاں غفلت پائی جاتی تو اس پر اظہار نکیر کرتے۔ چنانچہ ہذلی شاعر نے خود کو اس وقت مطعون کرنا مناسب تصور کیا اگر وہ اکرام ضیوف میں کسی طرح کی تساہلی کا شکار ہو۔

لادر دری الا اطعمت نازلکم

قشر الحتی وعندی البر مکنوز (۴۰)

عربوں کے یہاں غیر معمولی محبّت تھی، عزت نفس کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا کرتے تھے اور اس کے لیے کچھ کر گزرنے کو تیار رہتے۔ اس طرح ایفائے عہد بھی ان کے یہاں غیر معمولی چیز تھی۔ اس کو بہر حال پورا کرتے تھے۔ جیسا کہ عمرو کہتا ہے:

ونوجد نحن امنعهم ذمارا

واوفاهم إذا عقدوا یمینا(۴۱)

صاف ستھری پوشاک انھیں عزیز ہوتی، خوشبودار چیزوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے موضوعات سے ان کی شاعری لبریز ہے۔ عدوانی کی بیٹی اپنے شوہر کی تعریف اس طرح کرتی ہے:

حدیث الشباب، طیب الثوب والعطر (۴۲)

اسی طرح بالوں کو مشک سے معطّر کرنے اور خوشبودار چمڑے کی جوتیاں پہننے کو عرب خواتین ترجیح دیتی تھیں۔ ایک شاعر نے اپنی ممدوحہ کی یوں تعریف کی ہے:

اذا التاجر الداری جاء بفارة

من المسک اراحت فی مفارقه تجری

پرہیزگاری بھی ان کے یہاں اہمیت کی حامل شمار کی جاتی، حاتم طائی کے یہاں اس کا ذکر یوں ملتا ہے:

واغفر عوراء الکریم ادخارهٔ

واعرض عن شتم اللئیم تکرما(۴۳)

عرب اپنی فصاحت و بلاغت اور لطافت وظرافت پر اس قدر نازاں تھے کہ دیگر تمام اقوام کو

گونگا تصور کرتے۔ تکمیل فضیلت اس کے بغیر نا قابل تصور ہوتی جیسا کہ حاتم طائی نے اس کی اہمیت کا احساس یوں دلایا ہے۔

وإن غراراً ان یکن غیر واضح
فانی احب الجون ذا المنطق الدمم(۴۴)

نابغہ اپنی کند زبانی کو لے کر اللہ کے حضور یوں حاضر ہوتا ہے:

اعذنی رب من حصر وعی(۴۵)

بدکاری اور زنا کاری ان کے یہاں شی مذموم نہ تھی، بلکہ بصد افتخار اس کا برسر عام چرچا کرتے، شراب نوشی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ قمار بازی ان کا محبوب مشغلہ تھا، لونڈیوں کو گانا بجانا اور رقص کرنا سکھایا جاتا تھا۔ وہ حرام کاری کے لیے مجاز تھیں۔ اس کی آمدنی ان کے آقاؤں کو جاتی تھی۔ رہزنی، غارتگری اور قتل ان کے معمولات کا حصہ تھیں۔ انسانوں کا خون بلا خوف اور بلا تاسف بہاتے تھے۔ جنگ میں قید ہونے والی عورتوں کو فتح مند لونڈی بنالیا کرتے تھے۔ حارث شاعر کہتا ہے:

ثم ملنا علی تمیم فاحرمنا
وفینا بنات مراماء(۴۶)

ٹوٹکوں اور شگون لینے میں بھی انہیں نہایت اعتقاد تھا۔ جب کوئی مصیبت اور تباہی ان پر نازل ہوتی تھی تو پتھر کی چھوٹی چھوٹی کنکریوں پر کچھ پڑھ کر پھونکتے تھے تا کہ ان کے مصائب دور ہو جائیں، جانوروں کے اڑنے اور بولنے سے شگون لیتے تھے۔ اسی طرح جانور اگر کسی شخص کو بائیں طرف سے دائیں طرف کاٹتا تو نیک شگون لیتے تھے، اگر دائیں طرف سے بائیں طرف کاٹتا تو بدشگونی تصور کرتے، اور اسے ''جارح'' کا نام دیتے۔ اس طرح کے تفاءل کو ''طیرۃ'' کہا جاتا ہے:

لعمرک ماتدری الضوارب بالحصی
ولازاجرات الطیر ما الله صانع(۴۷)

عربوں کے یہاں منت ماننے کا تصور بھی عام تھا وہ کہتے کہ اگر یہ کام ہو گیا تو بھیڑ کی قربانی کریں گے۔ اس کو ''عتیرۃ'' کہا جاتا ہے۔ کعب اپنے خاندان کی تعریف میں کہتا ہے:

وماعتر الظباء بحی کعب(۴۸)

یہ دستور بھی تھا کہ جب کوئی مرجاتا تو اس کے اونٹ کو اس کی قبر پر باندھ دیا جاتا۔ یہاں تک بھوک پیاس کی شدت سے دم توڑ دیتا۔ لبید شاعر نے اپنے ممدوح کی سخاوت کی یوں تعریف کی ہے:

تاوی الی الاطناب کل ذریة
مثل البلیة قالص أهدامها(۴۹)

جب کوئی مرجاتا تھا تو دس روز تک اس کا سوگ رکھتے تھے اور اس کو رویا کرتے تھے۔ لبید نے اپنے وارثوں کو یوں وصیت کی ہے:

الی الحول ثم اسم السلام علیکما
ومن یبک حولاً کاملاً فقد اعتذر(۵۰)

مذکورہ اشعار کے علاوہ سرسید نے مزید اشعار نقل کرتے ہوئے عربوں کی خصوصیات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ ان اشعار کی روشنی میں عربوں کی رسم وریت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔(۵۱) سرسید کی اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دورِ جاہلی کی شاعری کا سرسید نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان اشعار کے بغیر ان کی معاشرتی زندگی تک رسائی ناممکن ہے۔ اشعار عرب کو اپنی مختلف بحثوں میں بنیاد بناتے تھے۔ اپنے مقالات اور اپنی تفسیر میں بھی مفردات کی توضیح وتشریح کے لیے کلام عرب سے استشہاد کیا ہے۔(۵۲) اسی بنیاد پر لفظ ''جن'' پر نہایت عالمانہ بحث کی ہے۔(۵۳) ان کے نزدیک ایک مفسّر کی کلام عرب پر گہری نظر ہونی چاہیے تاکہ بہت سے قرآنی اسالیب اور حقائق مفردات کا ادراک ہو سکے۔ ہندوستان کے تین مفسّرین مہائمی، سرسید اور مولانا حمید الدین فراہی نے کلام عرب سے استشہاد پر خاصا زور دیا ہے اور آخر الذکر مفسّر نے کلام عرب سے استشہاد کی بنیاد پر بعض اہم اور اچھوتے خیالات پیش کیے ہیں۔ سرسید نے تفسیر قرآن کے شرائط بیان کرتے ہوئے اپنے مقدمہ ''التحریر فی اصول التفسیر'' میں بھی کلام عرب سے استشہاد پر توجہ مرکوز کی ہے۔(۵۴)

بالعموم عربوں کے متعلق یہ عام تاثر موجود ہے کہ ان کے یہاں لڑکیوں کی ناقدری تھی۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ عمومی تاثر غلط ہے۔ عربوں کے یہاں عورتوں کو قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے ناز نخرے اٹھائے جاتے تھے۔ رہا لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کا مسئلہ تو یہ بدترین اور دل خراش روایت معدودے قبائل تک محدود تھی۔ اس میں تمام عربوں کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی تردید عباس محمود العقاد نے اپنی کسی تحریر میں کیا ہے۔(۵۵) خطبات احمدیہ میں بھی عرب قوانین کی توقیر کا ذکر ملتا ہے۔ ایک تو جنگوں میں ان کی عورتیں ان کے ساتھ ہوتی تھیں تاکہ محاذ پر ان کے اندر قومی جذبہ ابھار سکیں۔ ان کے آباء واجداد کے بہادرانہ کارناموں کو یاد دلا سکیں اور ان کے عزم وارادے میں صلابت ڈال سکیں۔ یہ خواتین اپنے شوہروں سے بھی کہتی تھیں کہ اگر تم نے پشت دکھائی اور ہمیں دشمنوں سے نہ بچا سکے تو ہم تمہاری بیویاں نہ ہوں گی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں میں عورتوں کو ایک نمایاں مقام حاصل تھا۔ عرب اپنی عورتوں سے کام لینا معیوب تصور کرتے تھے۔ اگر کوئی عورت دودھ دوہتی ہوئی نظر آجاتی تھی تو اس کا خاندان حقیر تصور کیا جاتا۔ خطبات احمدیہ میں منقولہ دونوں واقعات کے تناظر میں یہ کہنا ہرگز دشوار نہیں کہ عورتیں عربوں کے نزدیک محترم اور پروقار سمجھی جاتی تھیں۔(۵۶) عربوں کے رسوم میں ایک خاص چیز یہ تھی کہ مردوں کو قبر میں دفن کرنے کا بھی رواج تھا، جب اسے تدفین کے لیے لے جاتے تو راستے میں دیگر حضرات جنازہ کو دیکھ کر اس کی تعظیم میں کھڑے ہو کر اظہار تاسف کرتے۔(۵۷)

خانۂ کعبہ کے مقام و مرتبہ اور احترام و اکرام کا عہد رسالت سے قبل بھی تھا اور رسالت کے بعد بھی، سرسید نے اپنی اس کتاب میں دو نئے خانہ کعبوں کا ذکر کیا ہے۔ سرسید رقم طراز ہیں:

”خانۂ کعبہ کی ہمسری کے واسطے دو معبد اور یکے بعد دیگرے بنائے گئے تھے ایک تو قبیلہ غطفان نے اور دوسرا یمن میں قبائل ختام اور بجیلہ نے باشتراک بنایا تھا۔ ان دونوں معبدوں میں بت رکھے ہوئے تھے جن کو ان قبائل کے لوگ بطور معبود کے پوجتے تھے۔ ان نقلی کعبوں میں اول کو زہیر بادشاہ حجاز نے چھٹی صدی عیسوی میں بالکل غارت کر دیا تھا اور دوسرے کو جریر نے آنحضرت کے زمانہ میں یعنی ان کے پیدا ہونے کے بعد منہدم کر دیا تھا۔“(۵۸)

خطبات احمدیہ کے چوتھے خطبہ میں ولیم میور کے ان تاثرات کو نقل کیا گیا ہے جو اسلام کے متعلق اس نے ظاہر کیے۔ اس کا کہنا ہے اس کی وجہ سے وحدانیت کا غلغلہ ہوا اور بت پرستی کا خاتمہ، اللہ پر کامل توکل کی تعلیم عام ہوئی، اسلام کی معاشرتی تعلیمات خوبیوں سے مملوء ہیں، باہمی برادرانہ تعلقات اوج کمال پر تھے، یتیموں کے ساتھ حسن سلوک اور غلاموں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جاتا۔ نشہ آور چیزوں پر قدغن لگائی گئی۔ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ دین اسلام میں پرہیزگاری کا ایک ایسا اعلیٰ معیار ہے جس کا دیگر مذاہب میں اتا پتا نہیں ہے۔ لیکن ولیم میور کے نزدیک مذکورہ تمام تعلیمات اسلامی جنگوں سے عام ہوئیں۔(۵۹)

سرسید نے ولیم میور کے اس نقطۂ نظر سے عدم اتفاق کیا اور بتایا کہ قرآن کریم کی تعلیمات اور احکام میں ایسی تاثیر اور ایسا اعجاز ہے کہ کوئی بھی شخص اس کے سحر سے بچ نہیں سکتا، اس کی آواز کانوں میں پڑتے ہی انسان کی کایا ہی پلٹ جاتی، اس طرح کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے، خود اللہ کے رسول ﷺ کی شخصیت میں ایسی کشش اور رغبت تھی کہ لوگ آپ کے عاشق اور قدرداں ہو جاتے، انھیں اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان گنوانے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ نہ تھی، لیکن یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ آپ ﷺ کو ذرہ برابر کسی طرح کی گزند پہنچے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ولیم میور اور بہت سے دیگر مستشرقین بڑے حکیمانہ انداز میں دین اسلام پر تیر چلاتے ہیں، جب کہ کچھ مستشرقین نے اسلام کی حقانیت اور ہمہ گیریت کو تسلیم کیا ہے۔ انھیں میں سے ایک مشہور نام مسٹر جان ڈیون پوٹ کا ہے جس کی رائے میں اشاعت اسلام کا شمشیر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام نے حسن معاشرت اور شائستگی کی روح لوگوں میں پھونک دی۔ اس طرح اس نے یہ بھی وضاحت کی کہ فلسفہ اور علوم و فنون کے ارتقاء میں ایشیاء کے مسلمانوں اور اندلس کے خلفاء کا اہم رول رہا ہے۔ یورپ میں علم و حکمت کی بالادستی اہل اسلام کی دین ہے، اس نے تو یہاں تک تحریر کر دیا کہ سلطان صلاح الدین کی وجہ سے یورپ میں جاگیرداری کے نظام کا خاتمہ ہوا۔ مسٹر جان کے یہ تمام خیالات اس کی معروف کتاب "Apology for the Mohammad and Quran" میں موجود ہیں۔(۶۰)

اس سلسلے میں چیمبرز انسائیکلو پیڈیا کے ایک مقالے کا بھی سرسید نے ذکر کیا ہے جس میں قرآن کریم کے علم اخلاق کو سراہا گیا ہے اور مقالہ نگار نے یہ بھی بتایا کہ علوم وفنون کی ترقی میں یورپ دراصل اسلام کا رہین منت ہے۔ اس کے علاوہ بھی سرسید نے بہت سے دیگر مستشرقین کے مثبت خیالات کو نقل کیا ہے۔ طامس کارلائل (Thomas Carlyle) (۱۸۸۱ء۔۱۷۹۵ء) کے خیال کی بھی مدح سرائی کی گئی ہے۔ وہ ''لکچرز ان ہیروز'' میں لکھتا ہے:

''اسلام کا عرب کی قوم کے حق میں گویا تاریکی میں روشنی کا آنا تھا۔ عرب کا ملک پہلے ہی پہل اس کے ذریعہ سے زندہ ہوا۔ اہل عرب گلہ بانوں کی ایک غریب قوم تھے اور جب سے دنیا باقی تھی عرب کے چٹیل میدانوں میں بھی پھرا کرتے تھے اور کسی شخص کو ان کا کچھ خیال بھی نہ تھا۔ اس قوم میں ایک اولوالعزم پیغمبر ایسے کام کے ساتھ جس پر وہ یقین کرتے تھے بھیجا گیا۔ اب دیکھو کہ جس چیز سے کوئی واقف ہی نہ تھا وہ تمام دنیا میں مشہور و معروف ہوگئی اور چھوٹی چیز نہایت ہی بڑی چیز بن گئی۔''(۶۱)

سرسید نے ولیم میور کے تین بڑے اعتراضات کا نہایت مدلل اور مستحکم جواب دیا ہے۔ ایک یہ کہ دین اسلام کے باب میں ولیم میور اپنی عداوت یا کم سنی کی بنیاد پر کہتا ہے کہ اسلام میں تعدد ازدواج، طلاق دینے اور غلام بنا لینے پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ دوم یہ کہ لوگوں کو کسی مذہب کو اختیار کرنے کی اس میں آزادی نہیں ہے۔ اور سوم یہ کہ عیسائیت کی ترقی میں یہ دین اسلام مزاحم بن کر کھڑا ہے۔ ان تینوں اعتراضات کو سرسید نے بے بنیاد قرار دیا ہے۔ تعدد ازدواج کے تعلّق سے سرسید نے تحریر کیا:

''اس بات کا خیال کرنا ایک بڑی غلطی ہے کہ مذہب اسلام میں ایک سے زیادہ جورواں کرنی اسلام لانے والوں پر لازمی قرار دی گئی ہیں یا کچھ زیادہ ثواب کی بات ٹھہرائی ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے کہ عموماً ایک سے زیادہ جورواں کرنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔ صرف ان لوگوں کو اجازت دی ہے جن کو وجوہات طبعی سے ایسا کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر یہ عذر نہ ہو تو ایک سے زیادہ جورواں کرنی ان نیکیوں اور اخلاق کے بالکل برخلاف ہے جن کی ہدایت اسلام نے فرمائی ہے۔''(۶۲)

تعدد ازدواج کے مسئلے پر سرسید نے طویل گفتگو کی ہے اور اس کے تعلّق سے توریت اور مستشرقین کی آراء کا بھی جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ یہودیت اور عیسائیت میں بھی تعدد ازدواج پر قدغن نہیں تھی بلکہ اسے باعث رحمت اور زنا سے احتراز کا ایک نسخہ تصور کیا جاتا۔ سرسید نے بالکل بجا تحریر کیا ہے کہ یہ حال تو تعدد ازدواج کی نسبت مذہب موسوی اور عیسوی میں تھا اب ہم کہتے ہیں کہ مذہب اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازدواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے اور صرف ایک ہی بیوی کو پسند کیا ہے۔ تعدد کو صرف ایک نہایت محدود و خاص حالت میں جائز رکھا گیا ہے۔(۶۳) اسی مخصوص اور محدود صورتِ حال کو قرآن کریم میں یوں بیان کیا گیا ہے:

''وَلَن تَسْتَطِيعُواْ أَن تَعْدِلُواْ بَيْنَ النِّسَاء وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلاَ تَمِيلُواْ كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَإِن تُصْلِحُواْ وَتَتَّقُواْ فَإِنَّ اللّهَ كَانَ غَفُوراً رَّحِيماً. وَإِن يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّهُ كُلاًّ مِّن سَعَتِهِ وَكَانَ اللّهُ وَاسِعاً حَكِيماً''
(النساء:۴/۲۹۔۳۰)

(تم سے یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ اپنی تمام بیویوں میں ہر طرح عدل کرو، اگر تم اس کی کتنی ہی خواہش کرلو، اس لیے بالکل ہی ایک کی طرف مائل ہو کر دوسری کو ادھر لٹکتی ہوئی مت چھوڑ و اور اگر تم اصلاح کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بیشک اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت اور رحمت والا ہے۔)

مسئلہ طلاق کو لے کر مستشرقین نے اسلام پر خاصہ اعتراضات کیے ہیں، سرسید نے اس کا نہایت منطقی جواب دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ جس طرح نکاح انسان کی ایک اجتماعی اور دینی ضرورت ہے، اسے ایک ایسے ہم سفر کی ضرورت جو اس کی تنہائیوں کو آباد کرے، اس کے خلوت وجلوت کے تقاضوں کو پورا کر سکے، کبھی کبھی دونوں میں ایسی ناچاقی اور ناگواری پیدا ہو جاتی ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے کی شکل دیکھنا گورا نہیں۔ اب اسی بدسلوکی اور بے قراری کو دور کرنے کے لیے اللہ نے طلاق کا نظام رکھا ہے تاکہ اس بدسکونی اور اذیت سے دونوں کو نجات مل سکے۔ لیکن یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اسلام میں یہ بھی تاکید کی گئی ہے کہ ہر ممکن یہ کوشش ہو کہ دونوں میں نباہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی نظر میں طلاق ''ابغض الحلال'' ہے۔ سرسید نے اسی تعلق سے یہ تحریر کیا ہے:

''جب کہ ہم بہ لحاظ مذہب کے طلاق کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو یہ پاتے ہیں کہ مذہب اسلام ہی صرف ایک ایسا مذہب ہے جس نے طلاق کے مسئلہ میں سب سے زیادہ حسن معاشرت کی حفاظت اور اصلاح پر نظر رکھی ہے۔ یہودی مذہب میں طلاق دینا بغیر کسی قید وشرط وحالت کے مرد کے اختیار میں تھا کہ جب وہ چاہے طلاق نامہ لکھ کر جورو کے حوالہ کردے اور ایسا کرنے سے کسی حالت میں وہ کسی گناہ کا گنہگار متصور نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے اس حکم کو منسوخ کیا اور جیسا کہ حال کے زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں (اگر وہ صحیح ہو) تو بجز ایک خاص وجہ کے آڈر کسی حالت میں طلاق کا دینا جائز نہیں رکھا اور فرمایا کہ ''میں تمھیں کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی جورو کو سوائے زنا کے کسی سبب سے طلاق دے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی عورت سے بیاہ کرے وہ بھی زنا کرتا ہے'' اگر اس فقرہ سے جواز طلاق سمجھا جاوے جیسا کہ حال کے زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں (اور شاید وہ سمجھ صحیح نہیں ہے) تو یہ ایک ایسا سخت حکم تھا جس کی برداشت انسانوں سے قریب ناممکن تھی۔''(۶۴)

سرسید نے تعدد ازدواج پر نہایت حکیمانہ گفتگو کی ہے اور بلاوجہ تعدد پر ٹوٹ پڑنا اسلامی مزاج کے برعکس ہے۔ ایک طرف سرسید نے تعدد ازدواج کی حکمتوں کو بیان کیا ہے۔ دوسری طرف متعہ پر بھی

سخت اظہار نکیر کیا ہے۔ یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں جس کی وجہ سے اوباشی بڑھتی اور پاکیزگی زنگ آلود ہوتی ہے ان دونوں مسئلوں پر سرسید نے اپنی برہمی کا اظہار مندرجہ لفظوں میں کیا ہے۔

> ''ان تمام باتوں کے سمجھنے کے بعد ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والے یقین کریں گے کہ یہ جو تعدد ازواج اس زمانہ میں رائج ہے کہ جہاں ذرا دولت ہوئی اور دو دو اور تین تین اور چار چار جوروا ں کرنے لگے اور ایک بازار کی عورت کو داؤں پر چڑھایا اور نکاح کر مارا۔ جہاں مقدس بزرگ مولوی ہوئے اللہ میاں کے ساتھ بنے اس مریدنی کو لے ڈالا وہاں وعظ کہنے گئے اور مفت نکاح ثانی کو جاری کیا۔ قرآن پڑھاتے پڑھاتے دوسرا سبق خطبہ نکاح پڑھانے لگے۔ اور ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا اسلام میں پیدا کر کے عورتوں کو ٹھگنا شروع کر دیا۔ ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کچھ تعلّق نہیں ہے۔ یہ سب ایک قسم کی اوباشی کے ڈھنگ ہیں جن سے اسلام نفرت کرتا ہے اور وہ سب ہوا پرست اوباش ہیں جن سے اسلام کا نام بدنام ہوتا ہے۔ پس ایسے شخص کے افعال پر اسلام کی خوبی وحقیقت سے چشم پوشی کرنا چمگادڑوں کے لئے آفتاب کا سیاہ کرنا ہے۔''(۶۵)

اسلام کو جن جن حوالوں سے بدنام کیا جارہا ہے اس میں ایک بڑا مسئلہ رقیت یعنی غلامی کا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلامی مفکّرین کا سوادِ اعظم آج بھی اس کے جواز کا قائل ہے۔ سرسید نے اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق میں تردید رقیت پر قسط وار مضمون تحریر کیا۔(۶۶) غلامی کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ رقیت پر اسلام نے ہمیشہ کے لیے پابندی عائد کر دی ہے۔ آگے چل کر یہ قسط وار مقالہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔(۶۷) خاکسار نے اس کی افادیت واہمیت پر ایک مقالہ تحریر کیا۔(۶۸) سرسید نے اپنے انھیں خیالات کو یہاں بھی پیش کیا ہے اور مخالفین اسلام کے اس اعتراض کا مدلل جواب دیتے ہوئے بتایا کہ رقیت اسلام میں ہمیشہ کے لیے حرام قرار دی گئی ہے۔ جب کہ توریت اور انجیل میں غلامی کے جواز کی مثالیں موجود ہیں۔ فرنگستان میں غلاموں کی تجارت عام تھی اور اس کے خلاف مذہبی اور قانونی کوئی آواز بلند نہیں کی گئی۔ سرسید رقم طراز ہیں:

> ''میں اس بات سے واقف ہوں کہ وہ یہ ظاہری عذر کریں گے کہ وہ کسی شخص کو اس وجہ سے غلاموں کا مالک ہے قوم سے خارج نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ انجیل اور حواریوں کے ناموں کے ہر صفحہ میں غلاموں کا جواز تسلیم کیا گیا ہے مثلاً جہاں کہیں لفظ ''سروس'' یا ''دولوس'' پایا جاتا ہے اور اس کا ترجمہ خدمت گار کیا گیا ہے۔ وہاں اس کا ترجمہ غلام ہونا چاہیے۔ لفظ ''سروس'' کے لغوی معنی اس شخص کے ہیں جو بازار میں خریدا گیا ہو یا فروخت کیا گیا ہو اور ''فریدیدیئین'' ہمارے اجورہ دار اور خدمت گار کے نیم معنی ہیں۔ لیکن اگر بدقسمتی سے عیسائیوں کو خانگی غلامی کی اجازت دی جاوے تو اس سے کسی طرح پر یہ بات ثابت نہیں ہوتی ہے کہ افریقہ کی بردہ فروشی جائز ہے جس کی زیادتی کا زمانہ اگلے

لوگوں کے گمان میں بھی نہ تھا اور جو ہر طرح پر ان کی خانگی غلامی سے مختلف ہے۔''(۶۹)

سرسید نے مختلف دلائل دیتے ہوئے اپنے رسالہ ''ابطال غلامی'' میں صراحت کر دی ہے کہ اسلام میں اس کا کسی طرح جواز نہیں، خطباتِ احمدیہ میں اس بحث کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ اپنی اس بحث کو درج ذیل لفظوں پر ختم کیا ہے۔

> ''حسن نالائق اور خراب اور قابل افسوس حالت سے غلامی کا رواج مسلمان ریاستوں میں (بعض عیسائی ملکوں میں بھی) ہوتا ہے، اس کو دیکھ کر ہم کو کچھ کم رنج نہیں ہوتا مگر ہم اس خطبہ کو پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ جو شخص خود اس کا برتاؤ کرتا ہے یا اوروں کو کرنے دیتا ہے وہ ٹھیٹ اسلام کے حکم اور اس کے عالی اصولوں کے برخلاف عمل کرتا ہے اور وہ ضرور ایک دن اس حقیقی شہنشاہ کی ہیبت ناک عدالت میں بطور ایک گنہگار کے حاضر ہوگا۔ خواہ مکہ میں جا کر یہ کام کرے یا مدینہ میں۔(۷۰)

اسلام پر ایک بہت بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ مخالفین اسلام اور مستشرقین نے اس تعلق سے لٹریچر کا ڈھیر لگا دیا ہے اس ڈھیر کا صداقت سے کوئی سروکار نہیں، یہاں الزامات اور اتہامات کا طویل سلسلہ ہے۔ اسلامی محققین نے اپنے اپنے لحاظ سے اس کا جواب دیا ہے۔ مولا مودودی نے ''الجہاد فی الاسلام'' میں اس کا مدلل جواب فراہم کیا ہے۔ اسی طرح سرسید نے بھی اس کا مسکت جواب تحریر کیا ہے۔ سیرۃ النبی میں علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی اس کا قابل قدر جواب ترتیب دیا ہے۔ اس حقیقت سے وہی انکار کر سکتا ہے جسے اسلام سے چڑھ ہو اور تعصّب کی بنیاد پر اسلام کو جابر وظالم قرار دیتا ہو، سرسید بڑے اہتمام سے اس کی تردید کرتے ہیں:

> ''جس اصول پر کہ حضرت موسیٰ نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر کسی استثناء کے قتل وغارت ونیست ونابود کر دیں۔ اس اصول پر مذہب اسلام نے کبھی تلوار کو میان سے نہیں نکالا۔ اس نے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں کے نیست ونابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کر کے اسلام قبلوانے کا ارادہ نہیں کیا۔ ہاں بلاشبہ اسلام نے بھی تلوار کو نکالا مگر دوسرے مقصد سے یعنی خدا پرستوں کے امن اور ان کی جان ومال کی حفاظت اور ان کو خدا پرستی کا موقع ملنے کو اور یہ ایک ایسا منصفانہ اصول ہے جس پر کوئی شخص کسی قسم کا الزام نہیں لگا سکتا۔''(۷۱)

سرسید نے اپنی بات کو مستند بنانے کے لیے قرآن وحدیث سے دلائل پیش کیے ہیں لیکن ان تمام چیزوں کا احاطہ یہاں ممکن نہیں ہے۔ مذکورہ دونوں مآخذ کے علاوہ مستشرقین کے خیالات سے ثابت کیا ہے کہ دین اسلام ایک حریت پسند دین ہے۔ وہ لوگوں کی شخصی اور فکری آزادی پر پہرہ بٹھانے کا ہرگز قائل نہیں ہے۔ چیمبرز انسائیکلوپیڈیا کے ایک مضمون اندلس کے خلفاء کے متعلق بتایا گیا کہ انھوں نے دیگر

مذاہب کے متبعین کو مذہبی امور میں آزادی دے رکھی تھی۔اس طرح گاڈفری ہگنز نے عیسائی پادریوں سے اختلاف کرتے ہوئے بتایا کہ اسلام تعصّب اور ریاکاری سے پاک ہے۔اسپین میں رہنے والے عیسائیوں کو اس نے تنگ نہیں کیا، وہ اپنی ملکیت پر قابض رہے ان کے پادریوں، ان کے بشپ، بزرگوں اور گرجاؤں کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی نہیں کی گئی۔(۷۲) اس تناظر میں سرسید نے ایک فلسطینی عیسائی شاعر لامارتین اور ایک انگریز سیاح کے خیالات نقل کیے ہیں:

> ''صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہے جو دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھتے ہیں'' اور ایک انگریز سیاح سلیدن نے مسلمانوں پر یہ طعنہ کیا ہے کہ ''وہ حد سے زیادہ دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں'' اب دیکھو کہ یہ سب رائیں بہت سی بے طرفدار اور فیاض طبع عیسائی مصنّفین کی سر ولیم میور کے اس بے سند دعوے کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں ہے کیسی برخلاف ہیں۔''(۷۳)

سرسید نے نزول قرآن اور ترتیب قرآن کے متعلّق بھی اس کتاب میں بحث کی ہے۔تدوین قرآن اور ترتیب قرآن پر بے شمار مباحث ملتے ہیں۔ان میں بہت سے ایسے مباحث ہیں جنھیں پڑھ کر افسوس ہوتا ہے۔انھوں نے قرآن کریم کی تدوین و ترتیب کے متعلّق شکوک پیدا کیے ہیں۔اس تعلق سے سرسید، مولانا حمید الدین فراہی اور خالد مسعود کی آراء حد درجہ لائق ستائش ہیں ان کے نزدیک قرآن کریم کل کا کل بالفاظ خداوندی ہے، اسی طرح اس کی تدوین و ترتیب بھی توقیفی ہے۔اس کا ایک حرف بھی ادھر کا ادھر نہیں ہوا ہے۔اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے ہی عہد میں باشارہ اللہ قرآن کریم کو مدون کر دیا تھا اور اسے بین الدفتین مدون کر کے مسجد نبوی میں ایک ستون کے پاس رکھ دیا اس مصحف کو ''**اسطوانة المصحف**'' کہا جاتا ہے۔صحابہ کرام کو دورانِ تلاوت جب کہیں شبہہ ہوتا تو شکوک وشبہات کو دور کرنے کے لیے اس سے رجوع کرتے۔اس کی تفصیل یوں ہے:

> ''یہ بات روایت سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ کی حیات مبارکہ ہی میں لوگوں نے مصحف کی نقول اپنے استعمال کے لیے تیار کر لی تھیں۔ایک روایت کے مطابق حضور ﷺ نے مصحف میں دیکھ کر تلاوت کرنے والے کے لیے بن دیکھے تلاوت کرنے والے کی نسبت دوہرا اجر کی بشارت دی، ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب حضور کی حیاتِ مبارکہ میں مصاحف میسر آ چکے ہوں۔ایک روایت کے مطابق حضور ﷺ نے سفر میں قرآن کو ساتھ لے جانے کی ممانعت کی تا کہ اس کے ہاتھ کفار کے ہاتھ نہ لگیں۔ اور وہ ان کو ضائع نہ کر دیں۔''(۷۴)

اس حدیث کے تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اصل جامع رسول اللہ ﷺ ہیں، لیکن جامع القرآن نے اپنا تمام فریضہ بحکم الٰہی ادا کیا ہے۔آیات کریمہ کا Adjusment توقیفی ہے۔قرآن کی موجودہ ترتیب کے مطابق دوبار ماہ رمضان المبارک میں حضرت جبرئیل علیہ السّلام کو آپ ﷺ نے پورا

قرآن کریم پڑھ کرسنایا۔اللہ تعالیٰ نے ترتیب توقیفی کواس طرح بیان کیا ہے:

''لَا تُحَرِّکْ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِهٖ.اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْآنَهٗ.فَاِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهٗ.ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ''(القیامۃ: ۷۵/۱۶۔۱۹)

(اے نبیؐ) آپ قرآن کوجلدی (یادکرنے) کے لیے اپنی زبان کوحرکت نہ دیں اس کا جمع کرنا اور (آپ کی زبان سے) پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔ہم جب اسے پڑھ لیں تو آپ اس کو پڑھنے کی پیروی کریں۔پھراس کا واضح کردینا ہمارے ذمہ ہے۔)

مولانا فراہی نے اپنی تفسیر نظام القرآن میں اس کی نہایت جامع ومانع تفسیر کی ہے اور مدلل انداز میں جمع القرآن پر گفتگو کی ہے۔(۷۵) بالخصوص مولانا عبداللطیف علی گڑھی نے اپنی کتاب ''تاریخ تدوین قرآن'' میں ترتیبِ قرآن پر نہایت مدلل گفتگو کی ہے۔آپ کے استاذ گرامی علامہ شبلی نے بھی ترتیب القرآن کے باب میں مبہم گفتگو کی ہے۔(۷۶) اس طرح مشہور شیعی عالم مولانا سید علی نقی نقوی بھی اپنی تفسیر ''فصل الخطاب'' کے مقدمہ میں ترتیب قرآن پر لکھتے ہوئے اصل راہ سے دور جا پڑے ہیں اور ان کا یہ کہنا ہے کہ ترتیب قرآن کے وقت آیات کریمہ ادھرادھر چلی گئی ہیں۔(۷۷) لیکن سرسید نے نزول قرآن، کتابت قرآن اور تدوین قرآن پر قابلِ قدر گفتگو کی ہے۔کتابت کا سلسلہ بالکل اوائل نزول سے تھا۔یہ چمڑوں، ہڈیوں اور کھجور کی چھال پر لکھی جاتیں۔سرسید نے مختلف احادیث سے استدلال کرتے ہوئے بتایا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے عہد میں قرآن کریم کو ترتیب دے دیا تھا۔سرسید لکھتے ہیں:

''ایک اور روایت میں بخاری ان لوگوں کے نام بیان کرتا ہے جنھوں نے قرآن کریم کوحفظ کرلیا تھا اور ان کے نام یہ ہیں: عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، ابی ابن کعب اور ایک اور روایت میں آیا ہے کہ منجملہ مقتولین جنگ یمامہ کے جو پیغمبر خدا کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد ہوئی تھی، ستر شخص ایسے شہید ہوئے تھے جن کو قرآن مجید بالکل حفظ تھا۔ان تمام روایتوں سے دوامر بخوبی ثابت ہوتے ہیں: اول یہ کہ گو جناب پیغمبر خدا کی حیات میں قرآن مجید چمڑے وغیرہ پر کیسی ہی بے ترتیبی سے لکھا ہوا موجود ہو مگر جن لوگوں نے کی کہ پوری سورتیں یاد کر لی تھیں ان میں آیتوں کی بالکل ترتیب تھی۔اور وہ ترتیب آنحضرت ﷺ کے ہدایت اور حکم کے موافق تھی۔دوسرے یہ کہ جن لوگوں نے قرآن مجید کو ترتیب وار حفظ کرلیا تھا، اس سے یہ دلیل مستنبط ہوتی ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب بھی آنحضرت ﷺ کے فرمانے سے لوگوں کو معلوم ہوگئی تھی۔''(۷۸)

مستشرقین نے ''انزل القرآن علی سبعة احرف'' کی بنیاد پر قرآن کریم کو ایک مبہم اور مشکوک کتاب بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اسے عہد عتیق اور عہد جدید سے جوڑنے کی کوشش کی ہے جب کہ ان دونوں میں اختلاف قرات کا مطلب ہے تحریف، ناقلوں کی چوک اور غلطیاں، منقول عنہ سے سقم اور غلطیوں کا موجود ہونا اور کاتبین کا متون میں اصلاح کی کوشش کرنا، لیکن قرآن کریم کی قرأت

سبعہ کا ان مندرجہ چیزوں سے کوئی تعلّق نہیں۔ قرأت سبعہ کا مطلب یہ ہے کہ ابتداء میں آیات کریمہ مختلف چیزوں پر ادھر ادھر لکھی ہوئی تھیں اس لیے کبھی کبھی آیات کریمہ کو ملا کر پڑھنے میں دقت ہوتی تھی، ابتداء میں چوں کہ آیات کریمہ غیر منقوطہ تھیں اس لیے کچھ مقامات پر تلفّظ کی ادائیگی میں فرق ہوتا تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مختلف علاقوں میں رہنے کی وجہ سے عرب قبائل کے لہجوں میں فروق آ گئے تھے جس کی وجہ سے ''سبعہ احرف'' کا اطلاق قرآن کریم پر ہوا، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ الفاظ پر اعراب دینے کا رواج نہیں تھا جس کی وجہ سے کبھی کبھی قرأت میں فرق واقع ہو جاتا تھا، عربی زبان میں ایک ہی مادہ سے مختلف ابواب ہوتے ہیں جس کے ایک ہی لفظ کو مختلف قارئین مختلف ابواب سے سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے اعراب میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ (۷۹) لیکن ان تمام چیزوں کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن کریم میں کسی طریقے کی تحریف ہوئی ہے۔ سر سید نے اس بحث پر گفتگو کرتے ہوئے نتیجہ یوں پیش کیا ہے:

> ''تلفّظ کا اختلاف قریب قریب معلوم ہو گیا ہے کیوں کہ قریش کے تلفّظ کو سند قرار دینے میں کوشش کامیاب ہوئی ہیں۔ قریش ہی کے لہجہ اور زبان میں قرآن مجید نازل ہوا تھا اور اس لہجہ اور زبان میں جناب پیغمبر خدا اس کو پڑھا کرتے تھے لیکن چوں کہ اس زبان میں بعض حروف ایسے ہیں جن کا تلفّظ اور قوموں سے ادا نہیں ہو سکتا، اس سبب سے اس اختلاف سے بالکل پیچھا نہیں چھوٹا۔ مثلاً اگر ہم کسی ایک عجمی اور کسی بدو اور کسی تربیت یافتہ عرب کو قرآن پڑھتے ہوئے سنیں تو فوراً پہچان لیں گے کہ یہ اختلاف اب بھی موجود ہے۔ مگر یہ اختلاف صرف قرآن مجید کے پڑھنے میں محسوس ہوگا۔ نہ اس کے املاء میں اور اسی لیے یہ اختلاف ضبط تحریر میں نہیں آ سکتا، اس کا اندازہ کرنے کو ان لوگوں سے قرآن مجید کے سننے کی ضرورت ہے۔'' (۸۰)

ناسخ اور منسوخ کی بحث بھی خاصی طویل ہے اس پر علماء اسلام کے یہاں مختلف آراء پائی جاتی ہیں، مختلف لوگوں کے یہاں منسوخ آیات کی مختلف تعداد ہیں اور بہت سے مفسّرین اور ماہرین قرآنیات کے نزدیک ایک آیت بھی منسوخ نہیں ہے۔ ناسخ و منسوخ کا ایک مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ پہلا حکم اس لیے منسوخ ہوا ہے کہ اس میں کوئی نقص تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود اللّٰہ تعالیٰ ماضی، حال اور مستقبل سے واقف نہیں ہے، علماء کرام کے اسی خیال کو مستشرقین بھی لے اڑے، سر سید نے دوسرے مقامات پر مسئلہ نسخ پر مستند بحث کی ہے۔ سر سید نے آیات کریمہ پیش کرتے ہوئے اس کا نتیجہ اس طرح پیش کیا ہے:

> ''مذکورہ بالا آیتوں سے کوئی ذی فہم شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان سے قرآن مجید کی ایک آیت کے قرآن مجید کی دوسری آیت سے منسوخ ہونا پایا جاتا ہے بلکہ صاف اس میں اہل کتاب کا ذکر ہے اور اہل کتاب جو اس بات کے مخالف تھے کہ ان کی شریعت کے برخلاف کوئی حکم نہ ہو اس کی نسبت خدا نے کہا کہ ہم جس آیت یعنی حکم شریعت اہل کتاب کو منسوخ کرتے یا بھلاتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کی مانند بھیج دیتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس آیت سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کرتی ہے، بلکہ اس کو صریح شریعت اہل کتاب یا رسوم مشرکین سے علاقہ ہے، جن کی طرف خاص اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے جن کی شریعت کے احکام میں شریعت محمدی سے کسی قدر کمی وبیشی ہوگئی ہے۔ (۸۱) سرسید نے مسئلہ نسخ کے حوالے سے متعدد آیات اور احادیث نقل کی ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ کوئی آیت منسوخ نہیں ہے اس تعلّق سے سرسید نے ایک حدیث نقل کی ہے:

عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده قال سمع النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قوماً یتدارؤن فی القرآن فقال انما هلک من کان قبلکم بهذا ضربوا کتاب اللّٰه بعضه ببعض وانما نزل کتاب اللّٰه یصدق بعضه بعضاً فلاتکذبوا بعضه ببعض مماعلمتم منه فقولوا به وما جهلتم فوکلوه الی عالمه" (رواه احمد وابن ماجه)

(رسول اللہ ﷺ نے ایک قوم کو سنا کہ قرآن میں جھگڑا کرتے ہیں۔ پس فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ اسی سے ہوئے، خدا کی کتاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے لڑایا (یعنی رد کیا) اور خدا کی کتاب تو اس لیے اتری ہے کہ بعض سے بعض کی تصدیق ہو۔ پس بعض کی بعض سے تکذیب مت کرو۔ اس میں سے جو جانو وہ کہو اور جو نہ جانو اس کو اس کے واقف کار پر چھوڑ دو۔)

اس حدیث سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں میں کوئی آیت بھی کسی آیت کی ناسخ ہے نہ کوئی آیت منسوخ ہے۔ (۸۲) اس طرح ولیم میور کا یہ کہنا کہ قرآن کریم میں دوسو پچاس آیتیں منسوخ ہیں یہ ایک عبث اور بے بنیاد نقطۂ نظر ہے۔ (۸۳) قرآن مجید اپنے طرزِ بیان کے اعتبار سے الہامی اور آسمانی کتاب ہے اس کے علاوہ اپنے معانی اور بے شمار دیگر مباحث کی نوعیت سے بھی اس کا الہامی الاصل ہونا ظاہر وباہر ہے جیسا کہ قرآن کریم نے خود اپنے متعلّق بتایا کہ:

"قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَن يَأْتُواْ بِمِثْلِ هَـذَا الْقُرْآنِ لاَ يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيراً"(بنی اسرائیل:۱۷/ ۸۸)

(کہہ دیجیے کہ اگر تمام انسان اور کل جنات مل کر اس قرآن کے مثل لانا چاہیں تو ان سب سے اس کے مثل لانا ناممکن ہے گو وہ (آپس میں) ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔)

سرسید نے قرآن کریم کے چار اوصاف بیان کرتے ہوئے اس کی الہامیت کو ثابت کیا ہے (۱) دل پر اثر کرنے والی اس کی فصاحت وبلاغت۔ (۲) اس کے شرعی احکام۔ (۳) اس کے اخلاقی اصول۔ (۴) اور اس کے معاشرتی اصول کو پیش نظر رکھا جائے تو کوئی شخص اسے کتاب اللہ کہنے سے انکار نہیں کرسکتا۔ سرسید نے اس میں مشہور مستشرق مسٹر گبن (Gibbon) کے متعدد خیالات نقل کرتے

ہوئے اس کی نادانی پر اظہار تاسف کیا ہے کیوں کہ اس نے ہومر کی ایلیڈ اور موستھنیز کی فلیکس کو قرآن کریم کے شانہ بشانہ لا کھڑا کیا ہے۔ (۸۴) سر سید نے مسٹر کارلائل کے تاثرات کو بھی قلم بند کیا ہے:

''میرے نزدیک قرآن مجید میں سچائی کا جوہر اس کے تمام معانی میں موجود ہے جس نے کہ اس کو وحشی عربوں کی نظر میں بیش بہا کر دیا تھا سب سے اخیر یہ کہا جا سکتا ہے: یہ کتاب یعنی قرآن سب سے اول اور سب سے آخیر جو عمدگیاں ہیں وہ اپنے میں رکھتا ہے اور ہر قسم کے اوصاف کا بانی ہے۔ بلکہ در اصل ہر قسم کے وصف کی بناء صرف اسی سے ہو سکتی ہے۔'' (۸۵)

سر سید نے ولیم میور اور دیگر مستشرقین کے بہت سے قرآنی خیالات کو لغو اور بیہودہ قرار دیا ہے۔ (۸۶) لیکن اس پر اظہارِ افسوس کیا کہ یورپین زبانوں میں موجود قرآن کریم کے تراجم مستشرقین کے ہی کیے ہوئے ہیں۔ سر سید نے اس پر انتہائی قلق کا اظہار کیا ہے کہ کاش دنیا کی بے شمار زبانوں میں امت مسلمہ کے ہاتھوں سے یہ فریضہ انجام دیا جاتا۔ یہی رنج و غم مقدمہ ''تبیین الکلام'' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جہاں سر سید نے یہ تحریر کیا کہ انجیل کے تراجم اور تفاسیر کی جو کتابیات تیار کی گئی ہیں کاش اسی طرح کی کتابیات تراجم و تفاسیر قرآن کی ترتیب دی جاتیں۔ (۸۷) سر سید عالمی سطح پر امت مسلمہ کی علمی کارکردگی کو دیکھنے کے خواستگار تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ادارہ سر سید کے استاذ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے انگریزی میں موجود قرآن کریم کے تراجم کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے محاسن اور معائب دونوں پر مدلل انداز میں گفتگو کی ہے۔ (۸۸) انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں مستشرقین کی صداقتوں اور علمی کذب بیانیوں کا تحلیل و تجزیہ کیا ہے۔ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی کی ذات گرامی اس پہلو سے لائق ستائش ہے کہ دنیا کی مختلف جامعات میں اس موضوع پر محاضرات دیتے ہوئے اپنے علمی مقام کو منوایا، انگریزی تراجم قرآن سے متعلّق آپ کی کتاب غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ (۸۹) انگریزی تراجم پر ''علوم القرآن'' میں آپ کا مقالہ گراں قدر نوعیت کا حامل ہے۔ (۹۰) یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ آپ نے تفسیر ماجدی کو انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ (۹۱) اس وقت انگریزی میں اسلامیات اور قرآنیات کے حوالے سے قدوائی صاحب کا ایک بڑا نام ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں واقع ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کا ترجمان مجلّہ ''اسلام اور عصر جدید'' (اس شمارے میں تراجم مستشرقین کے قادیانی تراجم، اولین مسلم تراجم ممتاز مسلم تراجم، دیگر مسلم تراجم اور شیعہ تراجم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ سیرت طیبہ پر مستشرقین کی تصانیف کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: اسلام اور عصر جدید، (مدیر اختر الواسع)، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی، جلد نمبر ۴۵، جنوری ۲۰۱۳ء، شمارہ ا، ص: ۱۱۔۱۲۸) کا ایک پورا شمارہ آپ کے مقالہ انگریزی تراجم قرآن پر مشتمل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پروفیسر قدوائی نے سر سید کے علمی منصوبہ کو ایک حد تک منزل مقصود تک پہنچایا ہے تو شاید مبالغہ نہ ہو کیوں کہ یہ

سلسلہ سرسید کے تقابل ادیان سے متّصل ہے۔

سرسید نے خطبات احمدیہ میں ولیم میور کی متعدد ہرزہ سرائیوں اور نادانیوں کا ذکر کیا ہے۔جس نے مارکسی اور وینس سے مختلف روایات نقل کرتے ہوئے اسلام اور قرآن کو ہیٹا دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ایک روایت کے مطابق عبداللہ ابن مسعود نے آنحضورﷺ کی زبانی ایک آیت کولکھ لیا اور صبح کو کاغذ سے اسے اڑا ہوا پایا۔اللہ کے رسولﷺ نے فرمایا کہ وہ آسمان پراڑ گئی۔اس کے بعد یہ معجزنما خیال بھی سننے میں آیا کہ مسلمانوں کوقرآنوں میں سے اس کا اڑ جانا آنِ واحد میں ہوا۔(۹۲)

مذکورہ روایت کے متعلّق سرسید کا خیال ہے کہ یہ روایت ولیم میور کی ایجاد کردہ ہے۔اس کی کوئی حقیقت اور کوئی سند نہیں ہے۔اسی طرح اس نے آیات محکمات کے لیے ''وحی کامل'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔اس سے اس کے مبلغ علم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اسی طرح اس نے ترتیب قرآن کے متعلّق بھی بے تکی باتیں کہی ہیں۔اس کے نزدیک احوال کے مطابق اس کی معقول ترتیب نہیں ہے اور اسی تسلسل کے ساتھ اللہ کے رسولﷺ نے اسے پڑھنے کا حکم دیا ہے۔مکی اور مدنی آیات کریمہ کے نزول میں خاصا طویل وقفہ رہا ہے۔یہ وقفہ خوداس کی بے ربطی پر دال ہے۔(۹۳) یہ تمام چیزیں ولیم میور کی کم علمی پر دلالت کرتی ہیں۔(۹۴)قرآن کریم میں جس طرح کا تناسب وترابط پایا جاتا ہے اس کی مثال ملنی دشوار ہے۔ سرسید نے مقدمۂ تفسیر میں ربط قرآن پر گفتگو کی ہے۔(۹۵) اس کے علاوہ قدیم وجدید کے بہت سے مفسّرین نے نظم قرآن کو موضوع بحث بنایا ہے۔لیکن نظم قرآن کوایک نظریہ کی شکل دینے اور اسے مدلل صورت میں پیش کرنے کا سہرا مولانا حمیدالدین فراہی کے سر ہے اس نقطۂ نظر سے دنیا کے تمام مفسّرین میں آپ سرخیل کی مانند ہیں۔قرآنیات کے حوالے سے تیس سے زائد آپ کی تصانیف ہیں۔ان تمام تصانیف میں نظم قرآن کی رعایت رکھی گئی ہے۔اور ایک تصنیف بعنوان ''دلائل النظام'' صرف نظم قرآن ہی کے موضوع پر ہے۔نظم قرآن کیا ہے۔مولانا فراہی نے اس کی توضیح اس طرح کی ہے:

''نظم سے ہماری مراد سورہ کے اجزاء کی وہ باہمی مناسبت ہے جس کے معلوم ہونے پر پوری سورہ ایک جدت میں ڈھل جائے۔اس صورت میں کلام کا مفہوم اس قدر مربوط اور ایک ہی مرکزی مضمون کا حامل نظر آتا ہے کہ پوری سورہ متشخص ہوکر سامنے آتی ہے اور کلام میں ایک جمال، ایک پختگی اور وضاحت کا ادراک ہوتا ہے،نظم ایک سورہ تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس سورہ کی مناسبت ان سورتوں کے ساتھ معلوم ہوجائے جو اس کے ساتھ متّصل ہیں اگر ان کے ساتھ ان کی مناسبت واضح نہ ہوتو ان سورتوں کے ساتھ اس کا تعلّق معلوم ہوجائے جو اس سے پہلے یا بعد میں کچھ فاصلے پر واقع ہیں کیوں کہ عین ممکن ہے کہ جس طرح بعض آیات جملۂ معترضہ کے طور پر کلام میں آجاتی ہیں اسی طرح بعض سورتیں بھی معترضہ سورتیں بن کر آئی ہوں۔نظم معلوم ہوجانے کے بعد اول سے آخر تک پورا قرآن مناسبت اور ترتیب رکھنے والا اور کامل وحدت سے متّصف نظر آئے گا۔(۹۶) اپنے اس نظریہ کوعملی جامہ آپ

نے اپنی تفسیر ''نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان'' میں پہنایا ہے۔(۹۷) اس سلسلے کو مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں برتا ہے۔''(۹۸)

ولیم میور نے قرآن کریم کے متن کے باب میں بہت سے شکوک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔اسی طرح اس نے یہ بھی کہا ہے اگر حضرت ابوبکرؓ کا جمع کردہ قرآن اپنے متن کے لحاظ سے خالص ہوتا تو اس قدر جلد خراب کیوں کر ہو جاتا اس کا یہ دعویٰ کہ کچھ آیات کریمہ کی تلاوت صرف کچھ مدت کے لیے رہی۔نیز بہت سی آیات اندراج ہونے سے رہ گئیں۔سرسید نے اس کے اس طرح کے مزعومات کی مکمّل تردید کی ہے۔(۹۹)

خطبات احمدیہ میں حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السّلام، حجاز، خانہ کعبہ اور حجر اسود کے حوالے سے نہایت مفید گفتگو کی گئی ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے جس مسجد کو بنایا تھا وہی خانہ کعبہ ہے، اسی کو مسجد حرام بھی کہا جاتا ہے۔جو علاقہ حجاز ہے، خانہ کعبہ کے پاس اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السّلام کو لاکر بسایا، مقام سکونت پر مستشرقین نے اعتراضات اٹھائے ہیں سرسید نے ان اعتراضات کا مدلل جواب دیا ہے۔(۱۰۰) حجر اسود کے متعلّق سرسید نے تحریر کیا کہ:

> ''خود حضرت ابراہیم اور تمام ان کی اولاد میں یہ رواج تھا کہ خدا کی عبادت کی جگہ پر بطور ایک نشان کے لمبا بن گھڑا پتھر کھڑا کرلیا کرتے تھے اس کو مذبح یعنی قربان گاہ اور بیت اللّٰہ قرار دیتے تھے۔اور وہاں خدا کی عبادت بجالاتے تھے اور اس کے نام پر قربانی کرتے تھے۔پس کعبہ میں اسی رسم کا برابر جاری چلا آنا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس معبد کی اصل ابراہیم سے ہے۔''(۱۰۱)

توریت مقدس میں یہ شہادت موجود ہے کہ پتھر، قربانی اور بیت اللّٰہ نام رکھنے کی رسم حضرت ابراہیم سے چلی آرہی ہے۔اس کی قدامت کے متعلّق شبہ کرنا دلیل عبث ہے۔توریت سے کئی شہادتیں سرسید نے نقل کی ہیں:

> ''کتاب خرج ۲۵ میں لکھا ہے کہ اگر میرے لیے پتھر کا مذبح بنادے تو تراشے ہوئے پتھر کا مت بنائیو، کیوں کہ تو اگر اسے اوزار لگادے گا تو اسے ناپاک کردے گا۔''

ایک دوسری دلیل یوں ہے:

> ''اور کتاب پیدائش، باب ۲۸، ورس ۱۸، ۱۹، ۲۲ میں لکھا ہے کہ ''یعقوب صبح سویرے اٹھا اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنا تکیہ کیا تھا، لیکے ستون کی مانند کھڑا کیا خدا کا گھر اور اس نے سر پر تیل ڈالا۔اور اس مقام کا نام بیت ایل (یعنی بیت اللّٰہ، خدا کا گھر) رکھا اور کہا کہ یہ پتھر جو میں نے ستون کی مانند کھڑا کیا، خدا کا گھر یعنی بیت اللّٰہ ہوگا۔''

سرسید نے اس طرح کی آیات پر یوں تبصرہ کیا ہے:

> ''ان آیتوں سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیم اور اس کی اولاد کا یہ طریقہ تھا کہ خدا کی

عبادت کے لیے مذبح، ایک بن گھڑا پتھر کھڑا کر کے بناتے تھے، کبھی اس کے ساتھ کوئی مکان بھی بنا دیتے اور کبھی پتھر کھڑا کرنے کے بعد بناتے تھے اور اس کو بیت اللہ کہتے تھے، بالکل یہی حالت کعبہ کی اور حجر اسود کی ہے جو ایک بن گھڑا لمبا پتھر ہے، پہلے صرف حجر اسود کھڑا کیا تھا پھر جب وہاں کعبہ بنایا تو اس کے کونا میں اس کو لگا دیا۔"(۱۰۲)

خطبات احمدیہ کے محاسن بے شمار ہیں اس تصنیف کے بعد سیرت نگاری نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ عقیدت کے ساتھ ساتھ علمی اور تحقیقی رنگ اپنایا۔ یہ حقیقت ہے کہ سرسید نے سیرت نگاری میں ایک نئی تاریخ رقم کی، اس نئی تاریخ کے لیے بڑے پاپڑ بیلے، قرض لیے، کتب خانہ فروخت کیا، گھر کے برتن بیچے اور اپنی بیگم کے زیورات تک فروخت کیے انھوں نے اردو دنیا میں استشراق کا تعارف کرایا، مستشرقین کی گستاخیوں کا جواب دیا، بالخصوص سیرت نگاری کے میدان میں ان کی سازشوں اور عداوتوں کو بے نقاب کیا۔ یقیناً یہ مبالغہ نہیں کہ استشراقی مآخذ و مصادر پر جو دسترس سرسید کی تھی اس کی مثال عالم اسلام میں مفقود ہے۔ خطبات احمدیہ میں ولیم میور کی علمی خباثتوں کا مدلل جواب دیتے ہوئے بہت سے دیگر معروف مستشرقین کی غلطیوں کی گرفت بھی کی گئی۔

مآخذ کے اعتبار سے خطباتِ احمدیہ کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس میں قرآن کریم کو اولین ماخذ کی حیثیت دی گئی ہے۔ سرسید قرآنیات کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ مفسّرین کی آراء سے واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں کی تاریخ، ذبیح اور بیت عتیق وغیرہ کے سلسلے میں قرآن کریم کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ خطبات احمدیہ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں جگہ جگہ صحف آسمانی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ چوں کہ سرسید عبرانی زبان سے بخوبی واقف تھے اس لیے انھوں نے مترجم توریت، زبور اور انجیل سے استفادہ کرنے کے بجائے براہ راست اصلی صحف آسمانی سے استفادہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جابجا خطباتِ احمدیہ میں عبرانی اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔ بالخصوص توریت اور انجیل میں آپ ﷺ کی آمد سے متعلّقہ بشارتیں براہِ راست عبرانی زبان میں نقل کی گئی ہیں۔ یہ امتیاز کسی اور سیرتی تصنیف کو حاصل نہیں۔ یہاں یہ نکتہ بیان کرنا مناسب ہوگا کہ ایک مدلل سیرت رسول ﷺ لکھنے کے لیے عبرانی زبان سے بھی واقفیت ضروری ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ مجلّہ "السیرۃ" اور مجلّہ "تعمیر افکار" کراچی کے ایڈیٹر مولانا عزیز الرحمٰن نے اپنی سیرت سے متعلّق کتاب میں جلاء القلوب بذکر المحجوب اور خطبات کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی ہے اور سیرت نگاری کے میدان میں ان کے قائدانہ اور مجددانہ کردار کا اعتراف کیا ہے۔

۲۔ سیرت سے متعلّق سرسید کے چند مقالات: (۱) کیا اسلام زبردستی اور جبر سے پھیلا اور کیا آنحضرتؐ نے

دین حق کی اشاعت تلوار سے کی؟ (مقالات سرسید، گیارہویں جلد)، حضرت ابراہیم اور کعبہ کی تعبیر (مقالات سرسید، جلد چہاردہم)، ازواج مطہّرات رسول خداﷺ (مقالات سرسید، حصہ چہارم)، ان کے علاوہ بھی مقالات سرسید میں سیرت طیبہ سے متعلق متعدد مقالات موجود ہیں۔

۳۔ ولیم میور کی حیات وخدمات کے لیے دیکھیے: انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا

۴۔ سرسید احمد خاں اوران کا عہد، ثریا حسین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ،۱۹۹۳ء، ص: ۱۳۸

۵۔ الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ، سرسید احمد خاں، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،۲۰۰۳ء، ص: ۸

۶۔ سرسید احمد خاں اوران کا عہد، ثریا حسین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ،۱۹۹۳ء، ص:۱۱۳

۷۔ حیاتِ جاوید: مولانا الطاف حسین حالی مرحوم، اکادمی پنجاب لاہور، فروری ۱۹۵۷ء، ص: ۴۹۲، مکتوبات سرسید، ص:۴۳۔۴۴

۸۔ خطبات احمدیہ، (مقدمہ از جناب شیخ اسماعیل پانی پتی)، ص:۱۱

۹۔ مکتوبات سرسید، ص:۶۲

۱۰۔ مکتوبات سرسید، (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، زیرنگرانی سید عابد علی عابد) مجلس ترقی ادب، لاہور، ص:۶۲

۱۱۔ مکتوبات سرسید، ص:۷۴۔۷۵

۱۲۔ مکتوباتِ سرسید، ص: ۶۷

۱۳۔ خطوط سرسید، نظامی پریس، بدایوں، ص:۷۲

۱۴۔ خطباتِ احمدیہ (مقدمہ از جناب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)، ص:۹۔۱۰

۱۵۔ سرسید احمد خاں کے خطوط (مرتبہ وحید الدین سلیم)، حالی پریس پانی پت، ص،۶۴۔۶۵

۱۶۔ مکتوبات سرسید، ص: ۶۷۔۶۸

۱۷۔ الخطبات الاحمدیہ، ص:۱۱۔۱۲

۱۸۔ خودنوشت، ص: ۲۸۵

۱۹۔ تبیین الکلام، سرسید احمد، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۲۰۰۴ء، (مقدمہ)

20. The life and work if Syed Ahmad Khan G.F.I. Graham Idrah-i-sdaliyat-i-Delhi, Delhi1974, p.106

۲۱۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق (مئی ۲۰۱۴ء، ۳۳/۵) میں حدیث کے تعلّق سے سرسید کی تین تحریریں ہیں جن سے ان کے حدیث کے تئیں نقطہ نظر سمجھا جا سکتا ہے۔

۲۲۔ الخطبات الاحمدیہ، ص:۱۰

۲۳۔ المیزان بحوالہ الخطبات الأحمدیہ، ص:۱۰

۲۴۔ الخطبات الاحمدیہ، ص:۱۱

۲۵۔ ایضاً، ص:۱۲

۲۶۔ الخطبات الاحمدیہ، ص:۱۲

۲۷۔ الخطبات الاحمدیہ، ص:۱۲

۲۸۔ ایضاً، ص:۱۴

۲۹۔ ایضاً، ص:۱۹۔۲۰

۳۰۔ ایضاً، ص: ۳۷۔۳۷۸

۳۱۔ ایضاً، ص: ۳۸

۳۲۔ خطبات احمدیہ، ص: ۳۸۔۳۹

۳۳۔ ایضاً، ص:۹۱۔۹۲

۳۴۔ مولانا فراہی کی کتاب ''الرای الصحیح فی من ہو الذبیح ۱۶۴ صفحات پر مشتمل ہے اس میں توریت، قرآن مجید

اور بہت سی روایات اور اقوال علماء کرام کی روشنی میں بتایا گیا کہ ذبیح اسماعیل علیہ السّلام ہیں یہ کتاب ۱۹۹۹ء میں ''دارالعلم'' دمشق سے شائع ہوئی ہے۔

۳۵۔ شبلی نعمانی، علامہ، سیرۃ النبی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی، طبع جدید، ۱/ ۱۹-۱۰۰

۳۶۔ مولانا فراہی مکاتیب شبلی کے آئینہ میں، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی (علامہ حمیدالدین فراہی: حیات وافکار، مقالات فراہی سمینار)، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الفلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء، ص: ۴۴۲-۴۵۲

۳۷۔ کتاب الامالی، اسماعیل بن القاسم القالی، مطبعۃ دار الکتب المصریۃ، القاہرۃ، الطبعۃ الثانیہ، ۱۳۴۴ھ۔ ۱۹۲۶ء، الجزء الاول، ص: ۱۶

۳۸۔ دیوان بابط شرا، اعتنی بہ، عبدالرحمٰن المصطاوی دارالمعرفۃ بیروت، لبنان، الطبعۃ الثانیہ، ۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۶ء، ص: ۳۷

۳۹۔ دیوان امراؤالقیس، عبدالرحمٰن المصطاوی دارالمعروف، بیروت، لبنان، الطبعۃ الثالثۃ، ۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۶ء، ص: ۵۳

۴۰۔ دیوان الہذلیین، الدارالقومیۃ للطباعۃ والنشر، القاہرۃ، ۱۳۸۵-۱۹۶۵ء، القسم الثانی ص: ۱۵

۴۱۔ شرح القصائد العشر، ابوزکریا یحیی بن علی التبریزی، المطبعۃ السلفیۃ، بمصر، ۱۳۴۳ھ۔ص: ۲۲۹

۴۲۔ الخطبات الأحمدیۃ، ص: ۱۲۳

۴۳۔ دیوان حاتم الطائی، شرح غریبہ، وقدم لہ عبدالرحمٰن المصطاوی، دارالمعروفۃ بیروت، لبنان، الطبعۃ الاولی، ۱۴۲۶ھ۔۲۰۰۵ء، ص: ۸۱

۴۴۔ یہ شعر دیوان حاتم طائی میں موجود نہیں ہے۔

۴۵۔ البیان والتبیین، عمرو بن بحر الجاحظ، داراحیاء التراث العربی، دارالفکر للجمیع، ۱۹۶۸ء، ص: ۵

۴۶۔ شرح القصائد العشر، ابوزکریا یحیی بن علی التبریزی، المطبعۃ السلفیۃ، بمصر، ۱۳۴۳ھ۔ص: ۲۵۳

۴۷۔ دیوان لبید بن ربیعہ، اعتنی بہ حمدوطماش، دارالمعرفۃ بیروت، لبنان، الطبعۃ الثانیۃ ۱۴۲۸ھ۔۲۰۰۷ء، ص: ۷۵

۴۸۔ شرح دیوان کعب بن زہیر، الحسن بن الحسین بن عبیداللہ السکری، الدار القومیۃ للطباعۃ والنشر، القاہرۃ، ۱۳۶۹ھ۔۱۹۵۰م، ص: ۲۱۲

۴۹۔ دیوان لبید بن ربیعہ، ص: ۱۱۵ ۵۰۔ دیوان لبید بن ربیعہ، ص: ۵۱

۵۱۔ الخطبات الاحمدیۃ، ص: ۱۲۱-۱۳۴

۵۲۔ تفسیر سرسید میں کلام عرب (مطالعات سرسید، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۱۳ء، ص: ۵۹-۷۵

۵۳۔ تفسیر القرآن: ہوالہدی والفرقان، سرسید احمد خاں، نولکشور، لاہور، ۵

۵۴۔ تحریر فی اصول التفسیر، سرسید احمد خاں، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء، ص: ۵۸-۵۹

۵۵۔ سیرت عائشہ اور عباس محمود العقاد: سرت نگار، ابوسفیان اصلاحی، فکرونظر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۲ء، ۲۹/ ۵۳-۷۳

۵۶۔ الخطبات الاحمدیۃ، ص: ۱۲۶ ۵۷۔ ایضاً، ص: ۱۳۳

۵۸۔ الخطبات الاحمدیۃ،ص: ۱۳۰۔۱۳۱ ۵۹۔ الخطبات الاحمدیۃ،ص:۱۵۳
۶۰۔ ایضاً،ص: ۱۵۷۔۱۵۹ ۶۱۔ ایضاً،ص:۱۵۹
۶۲۔ ایضاً،ص:۱۶۰ ۶۳۔ ایضاً،ص:۱۶۴
۶۴۔ الخطبات الاحمدیۃ،ص: ۱۶۷ ۶۵۔ خطبات احمدیہ،ص:۱۶۷
۶۶۔ سرسید کا رسالہ ''ابطال غلامی، سب سے پہلے قسط وار تہذیب الاخلاق کی جلد دوم میں شائع ہوا۔ دیکھیے تہذیب الاخلاق (مدیر ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی)، مئی۲۰۱۴ء،۳۳/ ۵،ص:۱۳۔۸۰
۶۷۔ جامعہ کراچی کی استاذہ ڈاکٹر حمیرہ ناز نے مولانا سعید اکبر آبادی کے تاریخی شعور سے متعلق اپنے تحقیقی مقالہ میں اس رسالہ پر اظہار خیال کیا ہے۔
۶۸۔ الرق فی الاسلام: ایک جائزہ، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی (مولانا سعید اکبر آبادی: احوال و آثار، مرتبہ ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی، شعبۂ سنی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۰۵ء،ص: ۱۳۷۔۱۵۱
۶۹۔ الخطبات الاحمدیۃ،ص: ۱۷۷ ۷۰۔ ایضاً،ص:۱۸۳
۷۱۔ ایضاً،ص:۱۹۲ ۷۲۔ ایضاً،ص:۱۹۴ ۷۳۔ ایضاً،ص: ۱۹۸
۷۴۔ حیات رسول امی ، خالد مسعود (تلمیذ مولانا امین احسن اصلاحی)، قرآن وسنت اکیڈمی نئی دہلی، طبع اول مارچ،۲۰۰۴ء،ص:۵۳۴۔۵۳۵
۷۵۔ تفسیر نظام القرآن، علامہ حمید الدین فراہی، امین احسن اصلاحی، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ،۱۹۹۰ء،۱۴۱۱ھ،ص: ۲۰۷۔۲۱۳
۷۶۔ مقالات شبلی (باہتمام مولانا مسعود علی ندوی)، مطبع معارف، اعظم گڑھ،۱۳۷۳ھ،۱۹۵۴ء،۱/ ۱۔۲۲، علامہ کے اس مضمون کا جائزہ لینے کے لیے مقالہ ''تاریخ تربیت قرآن از علامہ شبلی نعمانی۔ ایک جائزہ'' تحریر کیا گیا ہے، دیکھیے شبلی نمبر (شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۸ء۔۲۰۰۷ء) شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ،ص:۱۱۴۔۱۲۲
۷۷۔ تفسیر فصل الخطاب الحاج سید العلماء مولانا السیّد علی نقی النقوی، مجتہد اللکھنوی، ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کراچی، پاکستان، باراول، جمادی الثانی،۱۴۰۶ھ/ مارچ ۱۹۸۷ء،۱
۷۸۔ الخطبات الاحمدیۃ،ص: ۲۷۱۔۲۷۶ ۷۹۔ الخطبات الاحمدیۃ،ص:صم۲۷۵۶۲۷
۸۰۔ ایضاً،ص:۲۷۹ ۸۱۔ ایضاً،ص۲۸۱ ۸۲۔ ایضاً،۲۸۳
۸۳۔ ایضاً،ص: ۲۸۵۔۲۸۶ ۸۴۔ ایضاً،ص۲۹۸۔۲۹۹
۸۵۔ ایضاً،ص:۲۹۲۔۲۹۴ ۸۶۔ ایضاً،ص:۲۹۴
۸۷۔ ایضاً،ص:۲۹۶ ۸۸۔ ایضاً،ص: ۲۷۱۔۲۷۲

89. Bibliography of Translations of the meanings of the Glorious Quran into English 1649-2002, Abdurrahim Kidwai, King Fahad Quran Lerning Comples, 2005, pp.1-469

۹۰۔ ایضاً، ۹۱۔ ایضاً

92. The Gloarious Quran: Text translation and commintary Abdul Majid Daryabadi, The Islamic Foundation, 2001/1422 H, pp1-1146

۹۳۔ الخطبات الاحمدیہ،ص:۲۹۹

۹۴۔ الخطبات الاحمدیہ،ص:۲۹۹۔۳۰۱

۹۵۔ ایضاً،ص:۳۰۴ ۹۶۔ ایضاً

۹۷۔ تفسیر قرآن کے اصول، علامہ حمید الدین فراہی (ترتیب وترجمہ خالد مسعود)،قرآن وسنت اکیڈمی، نئی دہلی،طبع اول اکتوبر۲۰۰۳ء،ص:۱۰۵

۹۸۔ مولانا فراہی نے قرآن کریم کی چودہ مختصر سورتوں کی تفسیر لکھتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ قرآن کریم میں نظم و مناسبت کے ربانی نظام کو جسے نظر انداز کر کے فہم قرآن کے حقوق ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ مجموعہ ہائے تفسیر اولاً دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سے شائع ہوئے، اس کے بعد ان کے تراجم میں مولانا امین احسن اصلاحی کی سعی مشکور شامل ہے۔اب یہی مجموعے دمشق سے شائع ہو چکے ہیں۔سورہ بقرہ،سورہ آل عمران اور سورہ الحج وغیرہ کی نامکمّل تفسیر بھی دمشق سے شائع ہو چکی ہیں۔اور دو جلدوں میں مولانا فراہی کے حواشی بھی ''تعلیقات'' کے نام سے آچکے ہیں۔ان تمام چیزوں میں نظم قرآن کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔

۹۹۔ تدبر قرآن میں کلام عرب سے استدلال، (قرآنیات کے چند اہم مباحث، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اشاعت اول، مارچ ۲۰۰۲ء،ص:۱۰۳۔۱۳۰

۱۰۰۔ الخطبات الاحمدیہ،ص:۳۰۲۔۳۰۷ ۱۰۱۔ الخطبات الاحمدیہ،ص:۳۱۴۔۳۱۶

۱۰۲۔ ایضاً،ص:۳۱۶